اردو زبان اور اس کا نام

تحقیقی اور تعمیری حقائق کے آئینے میں

کنول ڈبائیوی

شعبۂ اردو

کے۔ آئی۔ کالج۔ ڈبائی

ضلع بلندشہر یوپی

اُردو زبان
اور
اُس کا نام

تحقیقی اور تعمیری حقائق کے آئینہ میں

کنولؔ ڈبائیوی
شعبۂ اردو
کے۔ آئی۔ کالج۔ ڈبائی
ضلع بلند شہر یو۔ پی

طبع اول: دسمبر ۱۹۷۸ء

قیمت: ۱۵ روپے

تعداد: [illegible]۰۰ سو

طباعت:

شائع کردہ:

ملنے کے پتے

ڈاکٹر کنول ڈبائیوی، شعبۂ اردو۔ کے۔ آئی کالج ڈبائی۔ ضلع بلند شہر

تقسیم کار:

۱- انجمن ترقی اردو ہند۔ راؤز ایونیو اردو گھر ۲۱۲۔ دہلی۔ ۱

۲- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

۴- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

معنون

مرزا عزیز مرحوم کے نام جنھوں نے سنہ ۱۹۱۱ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں ا
ردو زبان کا نام پہلے پہل تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی تھی

عالی جناب پنڈت سندر لال کے نام
جو ہندوستانی تحریک آزادی کے علمبردار ہیں

اُردو زبان کے مختلف نام

پچھلی صدی کے اختتام تک اُردو کے ایک سے زائد نام رہے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے زمانے سے لیکر انیسویں صدی کے خاتمہ تک یہ ہندی، ہندوی، ہندوئی زبان دہلوی۔ گوجری (گجری گوجری بولی گجرات) دکنی، دکھنی، مورز مسلمانی۔ ہندوستانی (اندوستانی زبان ہندوستان) زبان اُردوئے معلیٰ زبان اردوئے شاہی۔ زبان اردوئے معلی محاورہ شاہجہاں آباد، ریختہ اور اردو کے مختلف ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ آخر مصحفی کے یہاں جاکر اس کا نام صرف "اُردو" قرار پایا۔ مستند ادیبوں میں شاید آخری بار غالب اور سر سید نے اس کو ہندی کے نام سے پکارا (ص ۱۶۸)

مقدمہ شعر و زبان

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

پیغام

ہ "دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی جو اس کو بولتی ہے یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے اس اصول کی بناء پر عرب کی زبان عربی فارس کی فارسی ترکستان کی زبان ترکی انگلستان کی زبان انگلش فرانس کی زبان فرنچ جرمن کی جرمنی وغیرہ کہی جاتی ہے ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے جس کو اس زبان سے نسبت ہے نہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی نقرہ کا اضافہ کیا جائے جس سے اس کے جنم بھومی کی کہانی معلوم ہو لفظ اردو سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی۔"

سید سلیمان ندوی

از نقوشِ سلیمانی

ے اگر اُردو کو چھوڑ کر اس کے اصلی اور قدیم نام کو زبان زد اور عام نہ کیا گیا تو ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

حیاتِ سلیمان ص۳۲

فہرس

مقدمہ

سید سلیمان ندوی نے یہ تقریر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبۂ اردو
میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۰ء کو اسٹریچی ہال میں کی تھی جس میں اردو کا نام بدلنے کی
موافقت کی گئی تھی۔ "مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ"

ہماری زبان کا نام

(سید سلیمان ندوی)

حضرات! قوموں اور زبانوں کے تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی ان کا خمیر اٹھتے
مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے ہندوستان کہتے ہیں اس سے ہمالیہ کے
دامن سے بحر شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے
پہلے اس کا نہ یہ نام تھا اور نہ یہ ساحل اس کی وسعت تھی اور مسلمانوں سے پہلے اس
ملک کا کوئی ایک ایسا نام نہ تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے
شروع ہو کر بنگال مدراس اور بمبئی کے کناروں پہ جا کر ختم ہوتا ہے بلکہ انتہا یہ ہے
کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے آج اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم
بنا لیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں
ملک کا نام سندھو تھا اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں ھ اور س
کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے اس طرح سندھو ہندھو ہوا اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایے
کی زبان میں دو لفظ تھے السندھ والہند کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے اور اس نام کو زبان کے معنی میں اتنا برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے عزت برتی اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالہ کر دیا اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلیٰ کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔"

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام اردو کے بجائے جو اٹھارہویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلیٰ کے صحن والیوان میں محدود ہو گئی تھی اس کو واقعی طور سے اس پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے جو اس وقت کا نام ہے جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعویٰ کر سکے مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان کو دھوکہ دینے کے لئے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہیں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اس کے بعد ہندوستانی اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہیئے جس کو اب غلطی سے عام طور سے اب اردو کہنے لگے ہیں۔

دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے جو اس کو بولتی ہے یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں

وہ بولی جاتی ہے اسی اصول کی بناء پر عرب کی زبان عربی فارس کی زبان فارسی ترکستان کی ترکی انگلستان کی انگلش فرانس کی فرنچ جرمن ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جاتی ہے ہندوستانی کا نام دینا چاہیئے

(۳) ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے جس کو اس زبان سے نسبت ہے نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ کا اضافہ کیا جائے جس سے اس کے جنم بھوم کی کہانی معلوم ہو لفظ اردو سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہیئے۔

(۴) ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتی ہے اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر صرف نفسانی اثر سے ہمارے اندر اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

(۵) اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی اور ہم کو اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

(۶) ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہیئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کی برابر کی نسبت ہو تاکہ یہ صوبہ اس اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کرسکے لفظ اردو میں یہ بات نہیں یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی مدراس لاہور کلکتہ پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا

حق پہونچتا ہے اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جا سکتی۔

(۷) لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نما یاں نہیں ہوتا اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھریگا۔

(۸) اس ملک کا نام "ہندوستان" مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا کرنے کے بعد نکلی اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے۔

(۹) لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراساں سے کوئی بولی لیکر یہاں آئے تھے جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں اور یہ بولی ہے جس کو انہوں نے ہندوستان آکر اختیار کیا یہ واقعہ اس بولی ہندوستانی کے اصل اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہوجاتا ہے اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہہ دور ہوجاتا ہے۔

(۱۰) اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گیرامرین اس کی صرف ونحو کو عربی و فارسی کی صرف ونحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے اور انھوں نے غلط طریق اور روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں اور اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے گو اب ہمارے زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اتری ہے اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے اس زبان کو صرفی نحوی تحقیقات کا رخ ایران و خراسان و ترکستان کی طرف مڑ کر ہندوستان کے صحیح قیام کی طرف ہوجائیگا اور اس سے زبان کی اصولی نحوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

(۱۱) اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ پورے ملک کی مشترکہ زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہو۔ اس کے اس پیارے نام کو رفتہ رفتہ پھیلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعویٰ کی بنیاد کھوکھلی کر رہے ہیں۔

(۱۲) چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی یا اسپینی اور اگلے یورپین یہاں آئے بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی مقالے میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے فرشتہ علی عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق لکھتا ہے کہ "ر تا بہ ہندوستانی تکلم نمی شد" شاہجہاں کے دور کی تاریخ بادشاہ نامہ ہے "نغمہ سرایانِ ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں اس لئے یہ شبہ دور ہو جانا چاہیئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے بلکہ

رکھا ہے بلکہ یقین کرنا چاہیئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہیئے۔

(۱۳) اہلِ نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ سمجھنے میں میر امن سے لے کر سرسید بلکہ آزاد مرحوم تک کو جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری جیسا کہ میر امن کا بیان ہے۔

> "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کے حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال وجواب کرتے کرتے ایک زبان مقرر ہوئی"
>
> (باغ وبہار)

جب حضرت شاہجہاں صاحب قرآن نے شہر دلی کو اپنا دارالخلافت بنایا اور وہاں کے

بازار کو اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا، سرسید نے بھی حکایت شاہجہاں کے عہد کی نسبت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اس غلطی کا سبب لفظ اُردو ہے اس لئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا لکھنا ہے اور اس کی اصلی تاریخ کو جواب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے برباد کرنا ہے۔

(۱۴) بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آپ بیتی میں ہندوستانی زبان کی کثرت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں بھی ہندوستانی کی تجویز منظور ہوئی ہے اور ان سب سے مراد ہندی ہے اس لیے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہوگئے ہیں اس لئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہیئے میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام ہندی متعارف تھا سرسید کے آثار الصنادید کے طبع اول میں اُردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی کو ہندی کہتے تھے ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپکو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اٹھا لینا پڑا اگر آپ اس کو بھی چھوڑدیں گے تو دوسروں کے قبضہ مخالفانہ سے ہرگز نہیں بچ سکتا یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے اور اس سے مراد ہماری وہی زبان جو ہماری بول چال میں ہے ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے افسوس کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی غلط بنایا جارہا ہے جذبات سے خالی ہو کر واقعتاً اور دلائل پر غور کرنا چاہیئے اور وہ قدم اٹھانا چاہیئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔ یہ تجویز کسی تحریک وتائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہی اپنی زبان کی بھلائی اور

ترقی کا خیال ہے اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں اردو کا نام اردو کسی ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا یہاں تک کہ سب پر چھا گیا غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے اس خیال کو اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا اور کبھی کبھی مضمون میں ادھر اشارے کئے گئے اتنے میں ہی یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں عرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخبار وں اور رسالوں کے اڈیٹر کر سکتے ہیں امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر زبان کے اپنے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کر دیں گے اور ثابت کریں کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام ہندوستانی ہونا زیادہ موزوں ہے اور یہ وہی زبان ہے جو عام ہندوستانیوں کی بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آجکل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جس میں ساہتیہ پرلشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا آج سے چھبیس ۲۶ برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرلشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے حاشا و کلا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ بعینہ اسی اور اسی زبان اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں اسے ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی اور دوسرے کا نام ہندی بتایا جو عام بول چال کی زبان تھی ہندی کا لفظ چھین گیا - اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے

نام ہندی کی جگہ دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجیئے خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھئے اس میں کچھ ہرج نہیں مگر اپنی علمی تعلیمی وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجیئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ صحیح نام ہندوستانی کے رواج دیدینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ہماری زبان کی بلائیں دور ہو جائیں گی بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کے اندر رسائی ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہیئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کا ہر بہی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارت کا خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انھوں نے پیش کئے ہیں آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں تاجروں کمپنی کے حاکموں اور لکھے پڑھے ہندوؤں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے بھی مشہور و معروف تھا جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے۔ ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

از نقوش سلیمانی

جائزہ

پروفیسر سید شبیر علی کاظمی پاکستان

اُردو کے نام سنیئے ہندی، ہندوی، بھاکا بھاشا، نبی جی کی بھاشا، مسلمانی بولی، ترک باٹ، ناگری، کھڑی بولی، زبان اورنگ آبادی، زبان گجراتی، دکھنی زبان، ہندوستانی زبان سیاہ زبانِ دہلوی، زبان پنجابی، اندوستان، زبان مور، آردا، ہندوستانی انڈین ورناکیولر، اردو معلیٰ، اردو

کا ایجاد ہے۔ مختصر یہ کہ اردو اپنے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے معروف۔ اردو کا لفظ بطور زبان سب سے پہلے مصحفی نے ۱۷۷۲ء میں استعمال کیا بالآخر اب اردو اس زبان کا نام ہے جو پورے ہندوستان اور پاکستان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں کسی زمانہ میں ہندی ایرانی قضیہ تھا۔ اس کی جگہ ہندی اردو جھگڑے نے لے لی۔ پاکستان میں بھی یہ بنائے مخاصمت بنی۔ اور ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اس کی ترقی دراصل اس کی مخالفت میں پوشیدہ ہے۔ یہ آکاش بیل کی خاصیت رکھتی ہے۔ یہ تمام جھگڑے مذہبی سیاسی اور معاشی تھے۔ ونیز اردو کے حروف تہجی کی ابتدائی ترتیب سے لے کر اس وقت تک ہندو مسلم اور انگریزوں نے اس کی مساوی خدمت کی ہے۔ اور اس طرح اس کو مختلف زبانوں سے سنوارا ہے۔ فطری لین دین کے تحت یہ زبان

لہ اردو کا موجودہ رسم بھی پنڈک تک کاشمیری کی ایجاد ہے۔

پھولتی اور پھلتی رہی۔ اور اس کی ترویج و اشاعت میں کسی حکم یا پالیسی کو دخل نہ تھا۔ مگر ہندوستان میں اس کی بدقسمتی نے اسے ذات پات کے چکر میں ڈال دیا۔ اس کی بہن ہندی دیوبانی کی جانشین ہو کر آکاش وانی بن بیٹھی ہے۔ اور اس کو ملیچھ کا بدنما داغ دے کر جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ کل تک یہی رام کی دلاری تھی اور سب کی آنکھوں کا تارا تھی مگر کیکئی کے طرفداروں کی بن آئی اور اس من موہنی سیتا کو دیس نکالا مل گیا۔ یہ اس کے بن باس کے دن ہیں۔ اس کے بعد رام کی لیلا کیا ہوگی کچھ نہیں کہا سکتا۔ اس کا فیصلہ وقت کریگا۔ البتہ ہمیں اپنی موہنی کو خلوص کی آنچ میں تپا کر اپنانا ہے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے ؎

نیا ہے لیجیے جب نام میرا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

رسالہ "اردو" کراچی ۱۹۶۶ء

ماخوذ سب رس حیدرآباد ماہ جولائی ۱۹۶۸ء)

وچار

انگلینڈ والے انگلش بولتے ہیں فرانس والے فرنچ جرمنی والے جرمن فارس والے فارسی ترکستان والے ترکی۔ عرب والے عربی پھر ہند والے کیوں ہندی نہ بولیں۔ اردو قافیہ میں آتی ہے نہ ردیف ہیں۔ نہ بحر میں نہ وزن میں ہاں ہندوستان کا نام اردوستان رکھا جائے تو یہاں کی قومی زبان اردو ہوگی۔

(آنجہانی منشی پریم چند مسلمانوں کی ہندی کا سیدا اثر)

پیش لفظ

زیر نظر کتاب جس کا نام "اردو زبان، اور اس کے نام" ہے۔ یہ کتاب ان مراسلات کی بنا پر تحریر کی گئی جو "ہماری زبان" کے ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء سے لگاتار ۲۱ جنوری ۱۹۷۵ء تک کے شماروں میں شائع ہو کر موجب بحث بنے۔ اس بحث کی بنا پر ہی مجھے اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور کتابی شکل دینے کا خیال پیدا ہوا۔ چند افراد کو ان خطوط کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے اردو کا نام بدلنے کا مسئلہ فرقہ پرستوں سے مرعوب ہو کر اٹھایا ہے لیکن اس کتاب کا مطالعہ ان افراد کے خیال کی تردید ثابت ہوگا اور انھیں اس موضوع میں کچھ وزن نظر آئے گا۔ دوسرے اس کتاب میں میں نے اردو کے قدیم وجدید کی ابتدا ارتقا، تاریخی، سماجی و ثقافتی اور لسانی پہلوؤں پر بھی مختصر مگر جامع روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ان موضوعات میں آپکو بہت کچھ حقائق کے نئے پہلو بھی ملیں گے۔

اردو کے نام بدلنے کی تحریک کو میں اپنے ذہن کی اختراع سمجھتا تھا لیکن جب میں نے اس موضوع پر تحقیقی کام کیا تو پتہ چلا کہ یہ تحریک نئی نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی متعدد بار یہ تحریک اٹھائی جا چکی ہے۔ اس تحریک کے حامیوں میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت سندر لال، منشی پریم چند اور ڈاکٹر تارا چند کا نام لیا جا سکتا ہے اور مسلم تائیدین میں مرزا عزیز اور مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو کا نام تبدیل کرنے

کی آواز اٹھائی۔ اور اس کا نام ہندوستانی رکھنے کے سلسلے میں جو لیکچر انھوں نے اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دیا تھا۔ اس کو مقدمہ کے طور پر میں نے اس کتاب میں شامل کردیا ہے۔ مرزا عزیز، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولوی عبدالحق صاحب کے ارشادات مجھے دستیاب نہ ہو سکے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں حضرات نے بھی اس سلسلے میں لیکچر اسٹریچی ہال میں دئیے تھے اور مرزا عزیز اسکے محرک تھے میں نے ان مراسلات اور جوابات کو بھی اس کتاب میں شامل کرنا ضروری سمجھا جو اس تحریک کے اصل محرک بنے۔ کیونکہ ان مراسلات میں میں نے اس موضوع کو اپنے ذہن کی اختراع سمجھ کر ابتدائی شکل میں پیش کیا تھا اس لئے یہ مراسلے میری اس وقت کی قلیل اور محدود معلومات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس لئے قارئین سے التماس ہے کہ کتاب پر نظر ڈالنے سے بیشتر کوئی نظریہ قائم کرنے سے احتراز فرمائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو اپنے آپ ہی مختلف معاشروں اور تہذیبوں کے اختلاط سے وجود میں آئی لیکن یہ روز اول سے ہی بدقسمت رہی۔ مغلوں نے کبھی اس کو منہ نہ لگایا، امرا اور علماء اس کو ہمیشہ حقیر و ذلیل سمجھتے رہے۔ اس کو اگر پناہ ملی تو درویش سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں، تاجروں، سپاہیوں اور شاہی حرم کے کارکنوں میں۔ اردو سے علماء کا تنفر اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ فارسی سرکاری زبان رہی۔ انگریزوں نے انگریزی کو سرکاری زبان بنانے کے بعد اس اردو کے ساتھ جو کرم فرمائیاں کیں اس کی مختصر تفصیل اس کتاب کے اوراق میں ملے گی۔ ١٩٤٧ء کے بعد جو کچھ گزشتہ حکومت نے اس کے ساتھ سلوک روا رکھا اور اس کو مٹانے کی کوششیں کیں وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس کی مثال دنیا میں سوائے پولینڈ کی تاریخ کے کہیں نہیں ملے گی اور اس وقت موجودہ حکومت جو کچھ بھی نوازش فرما رہی ہے وہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لیکن اردو اتنی سخت جان ہے کہ پھر بھی زندہ ہے اور انشاءاللہ زندہ رہے گی۔ برج بھاشا (ودھی)، میتھیلی اور دوسری زبانوں کو ان کی ابتدا سے آج تک کوئی سرکاری تعاون نہیں ملا۔ تو کیا یہ ختم ہو گئیں۔ اسعد ہمیشہ قابل رحم نہ ہوئے۔ میرے عزیز دوست بابو دیویندر پرشاد سکسینہ نے اردو

کو ایسی سیدھی گائے سے تشبیہ دی ہے جس پر ہمیشہ قصائیوں کا قبضہ رہا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ چھری چلاتے رہے ہیں لیکن وہ اپنے دشمنوں کو بھی دودھ پلاتی رہی ہے۔
اردو نے عیسائی، ہندو، سکھ، پارسی اور اسلام از جملہ مذاہب کی زبردست خدمت کی ہے۔ وطن کی آزادی کی لڑائی میں ہزاروں مجاہد اس زبان میں ترانے گاتے ہوئے سولیوں پر چڑھتے ہیں۔ اردو کو ڈیڑھ سو سال سے برابر محض اس کے اردو نام کی وجہ سے نقصان پہنچتا رہا ہے جس کی تفصیل آپ اس کتاب میں پائیں گے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں اس قومی زبان جس کے ہندی، ہندوی، ریختہ، ہندوستانی، کھڑی بولی اور اردوئے معلّٰی وغیرہ بہت سے نام تھے اس کے ایک حصّے کا نام ہندی رکھا گیا اور اس کے دوسرے حصّہ کا نام اردو مخصوص کیا گیا باقی سب ناموں کو ترک کر دیا گیا اور ان دونوں کے دو رسم الخط بھی مقرر کر دیئے گئے۔ اس قومی زبان کی سرپرستی کرنے والے بھی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اس طرح اردو کو نقصان پہنچا کیونکہ ہندو بھی جنہوں نے اس زبان کی شروع سے آخر تک تشکیل اور تعمیر کی تھی اس سے جدا ہو گئے۔ اس نئی ہندی کے یہ ابتدائی معمار اور مصنف للو لال جی، منشی سدا سکھ لال، انشاء اللہ خاں، راجہ شیو پرشاد، بھارتیندو ہریش چند، شیام سندر داس، رام چندر شکل وغیرہ بلکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے زیادہ تر ہندی داں شعراء اور مصنفین سب کے سب اردو و فارسی کے زبردست واقف کار تھے۔ لیکن لفظ ہندی کے لگاؤ نے ان سب میں اردو کی مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ میری ذاتی رائے میں اس زبان کو سب سے زیادہ ہندوؤں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے نقصان پہنچا۔ جس زمانہ میں اس کو تقسیم کیا جا رہا تھا اور اس کے دو نام رکھے جا رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو مٹانے کی اسکیم بنائی جا رہی تھی۔ ناگری رسم الخط کو بڑھاوا دیا جا رہا تھا۔ صوبائی زبانوں کو ابھارا جا رہا تھا اور ان میں سے عربی و فارسی الفاظ کو نکالا جا رہا تھا تو اس وقت ہمارے بزرگ اپنی نام کی پرستی میں مست تھے۔ ان کو اردو سے اس وقت کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اردو اس وقت یتیم اور لاوارث حالت میں تھی۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اگر اس وقت وہ

لوگ اس کی سرپرستی کرتے تو انگریزی ڈپلومیسی کامیاب نہ ہونے پاتی اور اردو فارسی کی جگہ سرکاری زبان ہوتی۔ کیونکہ اس وقت ہندوستان کی کوئی بھی زبان اردو سے زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی۔

دوسرا زبردست نقصان مولانا سید سلیمان ندوی کی نام تبدیل کرنے والی تحریک کو نہ ماننے سے پہنچا۔ اگر اس وقت ان کی بات مان لی جاتی اور اس کا نام ہندوستانی رکھدیا جاتا تو ایک فوری فائدہ یہ ہوتا کہ اس لسانی منافرت کا جال جو انگریزوں نے سو سوا سو سال پہلے پھیلا رکھا تھا پارہ پارہ ہوجاتا اور جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور ہندوستان کے ایک حصہ کا نام پاکستان رکھا گیا۔ اگر اس وقت اردو کا مولانا سید سلیمان ندوی کا تجویز شدہ نام "ہندوستانی" ہوتا تو بانیانِ پاکستان اردو زبان کا نام اپنے ملک کے نام کی مناسبت سے رکھنے پر مجبور ہوجاتے۔ اس کے علاوہ اردو کے پاکستان کی سرکاری زبان بننے سے جو لسانی منافرت تیز تر ہوتی تھی وہ بھی نہ ہوتی اور پاکستان میں بھی اردو کا مستقبل روشن اور پائیدار ہوجاتا۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے خلاف ہندوستان میں انتقامی ری ایکشن (Re action) کی جو لہر پیدا ہوئی وہ بھی نہ پیدا ہوتی اور ہندی کو پارلیمنٹ میں ایک ووٹ کی اکثریت سے کامیابی حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا اور اگر مل بھی جاتا تو آئین کی منظور شدہ ۱۵ زبانوں میں اردو کا نام اس کی سرزمین سے وابستگی ظاہر کرتا اور جو ہندی کا موجودہ علاقہ ہے وہ پورا علاقہ اس کا وطن قرار دیا جاتا۔ لیکن جو کچھ گذر چکا اس پر اب سوائے افسوس ظاہر کرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

دوستو! آؤ اب بھی اردو کے مستقبل کے لئے اس مسئلہ پر غور کریں۔ کچھ احباب کا اصرار تھا کہ جب تمہاری نظر میں موجودہ نام ضرررساں ہے تو اردو کے بجائے کون سا نام رکھا جائے اس بارے میں بھی میں نے اپنی رائے کا اظہار کردیا ہے۔ اور اس کے لئے میں کتاب کے آخری باب میں چند نام معہ ان کے قواعد کے تحریر کئے ہیں اور فیصلہ قارئین اور ارباب ادب پر چھوڑ دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے کچھ ابواب ہیں - اردو لفظ کی تاریخ، ہندی لفظ کی ارتقائی تاریخ اور اردوئے قدیم کی تشکیل و تعمیر میں ہندوؤں کا حصّہ ہے - ہندی ناموں کے اثبات اور آخر اردو کا نام کیا ہو - ان پر تفصیل سے اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے - میں قارئین اور اربابِ ادب سے التماس کروں گا کہ جذباتی لگاؤ سے دامن بچا کر اور اردو کے مفاد کے پیشِ نظر اس کتاب کو ایک بار ضرور ملاحظہ فرمائیں اور اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنی رائے سے ضرور نوازیں -

اس کتاب کو لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انگریزوں کی منافرانہ اور شاطرانہ لسانی حکمتِ علی پر روشنی ڈالی جائے جس سے اہلِ ہند کے دل میں لسانی تعصب کم ہو اور وہ اپنی گزشتہ غلطیوں کو محسوس کر سکیں - آخر میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس موضوع کی ابتداء مراسلے جات کی اشاعت میں جناب ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند نے کافی توجہ فرمائی - اس کتاب کی تیاری میں جناب ویریندر پرشاد سکسینہ، عزیزی اپن کنول، ایم - یو - سرور اور یونس سلیم نے میری امداد فرمائی ہے اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے - ان حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں - عزیزی شیریں شاہین نے جو اس کتاب کے پروف ریڈنگ میں مدد کی ہے - ان کا بھی میں بے حد شکر گذار ہوں -

نیاز مند

کنول ڈبائیوی

صدر شعبہ اُردو

کے - آئی - کالج - ڈبائی ضلع بلند شہر

ہندی نام کی وجہ تسمیہ

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان عہد قدیم سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اور ایشیا کی پرانی تہذیبوں میں ہندوستان کا بہت اہم مقام رہا ہے مصر بابل چین وایران کی تہذیبیں دنیا کی پرانی تہذیبیں سمجھی جاتی تھیں لیکن ہندوستانی کی تہذیبی قدریں ان سے بھی قدیم ترین ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی مشعل نے ان ملکوں کو اپنی روشنی سے جلا بخشی۔ جن کے تہذیبی وثقافتی نقوش اب بھی روس وچین ترکستان، منگولیا کے ریگستانوں اور مصر اور افریقہ کے میدانوں، دوسری جانب برما، سیام، کمبوڈیا، لاؤس، جاوا، چین، جاپان، سماترا اور لنکا میں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ میری اس بات کی تصدیق "تھورنٹن (THORNTON) کی کتاب "ہسٹری آف انڈیا (History of India)" سے ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مصر کے مینار ابھی دریائے نیل کے کنارے سے کھڑے بھی نہیں ہوئے تھے اور یونانی (دانش) میں جو حالیہ تہذیب کے گہوارہ ہیں ابھی جنگلی جانور بھی بستے تھے کہ ہندوستان دولت وثروت کا استھان بن چکا تھا۔"

برصغیر ہندوستان ہمالیہ اور راس کماری کے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ پندرہ لاکھ ستر ہزار مربع میل سے زائد ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد یہ پاکستان بنگلہ دیش، نیپال، ہندوستان اور لنکا میں تقسیم ہو گیا ہے۔ پھر افغانستان بھی سیکڑوں برس تک ہندوستان کا تہذیبی وثقافتی اور سیاسی حصہ رہا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دور میں یہ ہندوستان سے جدا ہو گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دسویں صدی عیسوی سے پہلے یہاں کے بیشتر عوام ہندو تہذیب کے پیرو تھے اور یہاں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ آریوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہندوستان برہم ورت آریہ ورت، کھنڈ، جمودیپ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بھگوت پران میں بھی جمودیپ کا ذکر کئی جگہ

آیاہے۔ بودھ مذہب کی مقدس کتب جو پالی (زبان) میں تحریر ہیں جنکا زمانہ تیسری صدی عیسوی قبل کا کہا جاتا ہے۔ میں بھی ہندوستان کو جمبودیپ ہی کہا گیا ہے مگر بدھسٹ لٹریچر میں جمبودیپ کی حدود چین کو چھوڑ کر پورے ایشیا تک بتائی گئی ہیں کیونکہ برہما (آدم) کو ہندو مذہبی کتب میں بنی نوع انسان کی نسل کو پیدا کرنے والا بتایا گیا ہے اور انکی پیدائش یہیں کی بتائی جاتی ہے۔ اس لئے پرانوں میں برہما جی کے توسل سے برہم ورت لفظ بھی ہندوستان کے لئے آیا ہے۔ جب آریہ اس ملک میں وارد ہوئے تو اسے آریہ ورت کہا گیا۔ ہندوستان کے قدیم ناموں میں ایک نام بھارت ورش بھی ملتا ہے۔ جس کا تعلق عہد قدیم میں ملک کے ایک طاقتور حکمراں راجہ بھرت سے ہے۔ اس کے نام پر اسے بھارت ورش یا بھارت کھنڈ بھی کہا گیا لیکن میرے قدیم دوست اور جنگ آزادی کے ساتھی مشہور سرودیہ لیڈر مسٹر رام کمار رکمل نے مجھے (رگ وید) کا ایک مختصر اشلوک دیا۔ جس کو نیچے تحریر کرتا ہوں۔

ऋग वेद :—

आहम
"विश्वामित्रस्य रक्षति
ब्रह्मेदं भारतम् जनम
भा := ईश्वरीय प्रकाश
रत :— लीन روشنی میں غوطہ زن ہونے والا

अनादि काल से ईश्वरीय प्रकाश में लीन
रहने वाला भारत देश !!

بہرحال اوپر کے اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس ملک کے عہد قدیم میں کئی نام رہے ہیں اور آخر میں اس کا نام ہندوستان رکھا گیا۔ جو سب سے زیادہ مشہور ہے۔

فرہنگ آصفیہ میں ہندوستان کے نام کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

(۱) کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ طوفان کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے تینوں بیٹوں

(باقی ص ۲۶ پر)

ہوا یہ نام کس طرح رکھا گیا۔ کہاں سے آیا۔ اس میں مورخین میں اختلاف ہے اور اس کا
بھی ایک مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ ہندوستان لفظ کے بارے میں بعض لوگوں کا
جن میں سید سلیمان ندوی جیسے محقق بھی شامل ہیں کا خیال ہے کہ ہندوستان نام مسلمانوں

(بقیہ ص گزشتہ) یعنی سام، حام، یافث کو اطراف جہاں میں بھیج کر ملک کی آبادی اور کاشتکاری کا حکم دیا چنانچہ ان میں ہر ایک نے ایک ایک سمت کی راہ لی انھیں کی اولاد یا ان کے ناموں سے دنیا کا ہر ایک ملک نامزد ہوا پس حام، جنوب کی طرف چلا اور اس کی آبادی میں کوشش کی حام کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑا بیٹا ہند نامی تھا جس نے اپنے نام پر اس ملک کو یہاں آباد کیا تھا دوسرا سندھ جو ملک سندھ میں آ کر ٹھہرا اور اپنے بیٹوں کے نام پر شہر ٹھٹھہ ملتان بسایا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ زبان سنسکرت میں سندھو دریائے کلاں کو کہتے ہیں۔ جب آریا قوم جس کی زبان سنسکرت سے ملتی ہوئی یعنی قدیم پارسی تھی یہاں مغرب سے آئی تو سب سے پہلے دریائے اٹک اس کی نظر سے گزرا جس کا نام اس نے سندھو رکھ دیا اور اسی کے نام سے اس کے نواح کے ملک سندھو کہلائے چونکہ س اور ہ کا سنسکرت میں اور زبان فارسی میں باہم بدل ہے اس وجہ سے سندھو سے سندھ اور ہندھ ہو گیا اور سندھ کا نام بدستور رکھ کر باقی ملک کا نام ہند کہنے لگے۔ باقی چار پہاڑیوں کے نام یہ تھے حبش (فرنج) بربر (نوبیہ) پہلے معنی ہند کے یہ ہوئے کہ حام کے بڑے بیٹے اور نوح کے پوتے کا نام ہے یا سندھو سے ہند ہوا۔

(۲) ہندوستان بھارت کھنڈ آریا ورت ایشیا کے سولہ ملکوں میں سے چودھواں ملک کا نام ہے جو عین جنوب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ۲۰ کروڑ سے زیادہ ہے جس کی ٹھیک مقدار آ گے ہے اور مختلف مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ سب سے زیادہ ہندو ان سے کم مسلمان اور باقی دیگر اقوام حدود اربعہ یہ ہے شمال میں ہمالہ جنوب میں بحر ہند اس کاری مشرق میں برہما آسام مغرب میں کوہ سلیمان ملک سندھ خلیج کمیاح بلوچستان وغیرہ اس ملک کی ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے مواقع ۲۸۷۲۲۳۴۳ ہے ص ۲۳۲، فرہنگ آصفیہ جلد چہارم طبع نیشنل اکاڈمی دہلی۔ فرہنگ آصفیہ ۱۸۹۲ میں لکھی گئی۔

کی دین ہے لیکن موجودہ تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں سال پیشتر ایرانی باشندے جنکا اور آریوں کا خاندان ایک ہی تھا۔ اس ملک کو ہندوستان اور یہاں کی قوم کو ہندو کہتے تھے۔ فارسی میں ستان اور سنسکرت میں استھان ایک ہی معنی کے لئے مستعمل ہیں، ایران میں سیتان، زابلستان، ترکستان اور بعد میں افغانستان کافرستان ایرانیوں کی ہی دین ہیں۔ محمد بن قاسم کے زمانے میں سندھ میں سوئستان نام کا شہر بھی تھا۔

ہندی سروے کمیٹی کی رپورٹ صفحہ نمبر ۱۴۔ ۵ میں رائے بہادر سیتارام نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ان کی تحقیق ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب ستاتیر میں اس دیش کا نام ہندو لکھا ہوا ملتا ہے اور وہ اسے سندھو کا روپانتر بتاتے ہیں فارسی زبان میں "س" اکثر "ہ" سے بدل جاتی ہے اس لئے فارس والے سندھو کو ہندو کہتے تھے اور اس بنا پر یہاں کے رہنے والوں کو ہندو اور اس ملک کو ہندوستان کہا گیا۔ سوگیہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" کے صفحہ ۲۳ پر بھی یہی بات دہرائی ہے کہ "ہندو" لفظ فارسیوں کی پرانی کتاب اوستا میں آج سے ہزاروں سال پیشتر اہل ہند کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ رائے بہادر سیتارام کی ہندو والی بات کو بھی پنڈت نہرو نے بھی مانا ہے لیکن انہوں نے اس اقتباس میں یہ بھی بتایا ہے کہ مشہور چینی سیاح "آئی تسنگ" جو ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں آیا تھا اپنے سیاحت نامہ میں وسطی ایشیا کے شمالی قبیلوں تک کو ہندو (HINDU) کہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمبودیپ کی طرح ہندوستان کی حدود بھی وسط ایشیا تک مانی جاتی تھیں اس بات کی تصحیح "این ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا" کے مصنفین موجاندار رائے اور دتا نے بھی کی ہے کہ قدیم فارسی کتب میں اس ملک کے رہنے والوں کو ہندو کہا ہے اور مسلمانوں کے دور حکومت میں یہ لفظ عام ہو گیا۔ تاریخی حقائق پر نظر ڈالنے سے ایک بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو لفظ ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ وسط ایشیا کے لوگ بھی اکثر یہ نام رکھتے تھے۔ ہمایوں کے ایک سردار بیرم خاں کے ایک مغل

ساتھی کا نام جو ترکستان کا باشندہ تھا۔ ہندو بیگ تھا۔ حضور صلعم کے چچا ابو سفیان کی بیوی کا نام بھی ہندہ تھا۔ ابن عرب نے کیونکہ علم ریاضی ہندوستانیوں سے سیکھا تھا اس لئے اس کے لئے انسا ہندسہ ہی رکھا۔ البیرونی نے افغانوں کو ہندو کہا تھا جو پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے اور اپنی کتاب کا نام "الہند" رکھا۔ اس طرح ہمایوں کے ایک بھائی کا نام ہندال مرزا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مورخ کا نام محمد قاسم ہندو شاہ تھا اور اس کے باپ کے نام کے آگے بھی ہندو شاہ لگا ہوا تھا۔ شاید ان کے خاندان میں کئی پشت سے یہ نام کنیت کے طور پر چلا آتا تھا۔ تاریخ میں اور بھی اس طرح کے نام ملتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جہانگیر کے وقت تک یہ نام کسی قوم یا فرقہ کی میراث نہ تھا بلکہ سیکولر نام تھا۔ سوگیہ ڈاکٹر رادھا کرشن نے ہندو لفظ کی تشریح اس طرح کی ہے

हिमालयी समारभ्य । वहं सालमकाते । अधनत

ہمالیہ کا "ہ" اور اندو سرودر "جو کہ کیپ کمارن میں ایک تالاب ہے کے آخری لفظ "ندو" کو لے کر ہندو کہا گیا ہے۔ یہ ہمالیہ سے لے کر کیپ کمارن تک ہندوستان کی حدود کی تشریح ہے۔ یہ اقتباس ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں دیا تھا۔

हिंसान दूयते इति हिन्दु

انہوں نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے "جو تشدد سے نفرت کرتا ہے اسے ہندو کہتے ہیں"

ہندو لفظ اور ہندوستان کے بارے میں ایک تشریح اور بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ جیسے سورگیہ پنڈت نہرو نے "باپ کے خطوط بیٹی کے نام" میں تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "ہمالیہ سے وندھیاچل اور پنجاب سے بنگال تک کا علاقہ چاند کی شکل کا ہو جاتا ہے۔ آریہ چاند کو بے حد مقدس مانتے تھے اور اس کی مشابہت کی بنا پر اسے اندو دیش کہتے تھے۔ انہوں نے اپنے مقدس شہر جیسے بنارس، الہ آباد وغیرہ بھی چاند کی شکل میں بسائے تھے اب تک چاند نکلنے اور ہلال سے بدر ہونے تک یعنی ماؤس اور پورن ماشی اور

اہل ہنود
پانڈ گرہن کے ایام میں گنگا اشنان کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اہل عرب بھی ہندوستان
کو ملک بدر کہا کرتے تھے کیونکہ یونانی میں "د" کا تلفظ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندو
کو یونانیوں نے انڈو کہا پھر انڈیا ہو گیا کیونکہ یونانی ہندوستان میں صرف پنجاب اور
سندھ تک آئے تھے اس لئے انھوں نے اس ملک کے مشہور دریا کو انڈس کا نام دیا
یہی اندو دیش ایرانیوں کی اصطلاح کے طفیل ہند دیش اور ہندواستھان سے
ہندوستان ہو گیا۔

سوگیہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی تھیوری کے مطابق میرے خیال میں ہمالیہ
کا ہ اور اندد (قمر) کا اندر لے کر ہندوستان بنایا گیا کیونکہ پیانے زمانے میں شمالی ہندوستان کو
ہی ہندوستان کہا جاتا تھا اور دکن اس سے الگ مانا جاتا تھا اس بنا پر ملا وجہی نے اردو ئے
قدیم کی زبان کو زبانِ ہندوستان کہا اور کئی دکنی شعراء نے ہندی کہا، بمبئی، گجرات
اور حیدر آباد میں اب بھی یوپی والوں کو ہندوستانی کہا جاتا ہے اسی لئے فانی

سلہ ڈاکٹر عبداللہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں اور اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں
یہ بات بھی متحقق ہو چکی ہے کہ پورے ملک کے لئے کبھی ایک نام نہیں تھا در اصل بھارت
ورش کا تصور جذباتی تسکین کی ایک آڑ تھی جس کے پیچھے مفہوم کی وحدت نہ تھی چنانچہ مختلف زبانوں
میں یہ لفظ پورے ملک کے لئے نہیں بلکہ مختلف علاقوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً آریہ پنجاب میں
تھے تو انھوں نے اپنے علاقہ کو برہم دستی دیش کہا جب دو آبے میں آباد ہوئے تو مدھیہ پردیش اور
شمالی میں بستے تو اس محدود علاقہ کو بھارت ورش کا نام دیا (آریوں کی آمد سے پہلے اس کا کیا نام
تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح آریہ ورت کل سرزمین کا نہیں صرف وادی گنگا کے علاقہ
کا نام تھا۔ اے۔ کے۔ پانیکر نے جو گرافیکل فیکٹران انڈین ہسٹری صفحہ
(Geographical Factors In Indian History
Page 9
پر جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لسانی سیاسی اور نسلی بنیاد کے پیش نظر

(باقی اگلے صفحہ پر)

بدایونی نے جب وہ حیدر آباد دکن میں رہتے تھے یہ شعر کہا تھا۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور

میرامن نے بھی باغ وبہار کے دیباچہ میں بنگال اور ہندوستان کو الگ بتایا کہتے ہیں

سوا اردو کی آراستہ کر زبان
کیا میں نے بنگالا ہندوستان

مشہور فرنچ مورخ ڈاکٹر لی بان کا خیال ہے کہ یہ نام اندر دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے اصلیت خواہ جو کچھ بھی ہو ہند اور ہندوستان لفظ کی بنیادی تاریخ کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس لفظ کے موجد ایرانی تھے۔

ہندو ہندوستان کے الفاظ کے ساتھ ایک لفظ ہندی بھی ہے جس کی تشریح بھی محققین نے مختلف پہلوؤں سے کی ہے۔ لیکن پروفیسر (Lacey) K اور گریرسن اس لفظ کی معنوی حیثیت کے بارے میں ایک آواز ہو کر کہتے ہیں۔

۱۔ ہندی ہندوستان کی ہر زبان کو کہتے ہیں
۲۔ ہندی سے مراد ہندوستان کے باشندے ہیں۔
۳۔ ہندی سے مراد شمالی ہندوستان کی زبان ہے۔

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) وہ ہند و ہندوستان تھے ایک آریہ ورت یا ہندوستان وہ مراد دکن ان یورپی مورخین سے ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہاں لوگ محدود علاقے سے ہی جذباتی لگاؤ رکھتے تھے اور قومی وفاداری پر علاقائی وفاداری کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ آج بھی یہی جذبہ کچھ فرقہ کے ساتھ قومی وحدت کے جذبے پر غالب نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ سہ ماہی قومی یکجہتی نمبر سنہ ۱۹۷۲ء مضمون قدیم ہندوستان اور یکجہتی

۴۔ ہندی سے مراد ہندوستان کی موجودہ سنسکرت آمیز ہندی ہے ۔

۵۔ اردو زبان کے قدیم تذکروں میں لفظ ہندی اردو کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے

فرہنگ آصفیہ میں ہندی لفظ کی معنوی حیثیت اس طرح ظاہر کی ہے ۔

ع(۱) ہند سے نسبت رکھنے والا منسوب بہ ہند (۲) ہندوستانی ہند کا رہنے والا (۳) ہند کی تلوار (۴) ہندوستان کی وہ زبان جو سنسکرت سے نکلی ہے پراکرت پالی برج وغیرہ (۵) وہ خط جس کی نسبت مشہور رہے کہ ہندی دیوناگری کا ہتی وغیرہ (۶) ہندوستان کی چیز (۱۹۷۴ء جلد چہارم طبع نیشنل اکاڈمی دہلی

مہاتما گاندھی جی نے ہندی لفظ کے بارے میں بھارتیہ سمیلن کے دوران اپنی تقریر میں فرمایا "اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ ہندی لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے مسلمان اور ہندو لکھتے پڑھتے ہیں۔ لاتعداد مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ہندی نام سے موسوم کیا ہے پھر اب جب کہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمانوں کے ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغہ کیوں ہے ۔

لفظ اردو اور ہندی پر بحث کرنے سے پہلے میں صاحب رائے اور ملک کے صاحب علم اور ملک کے مسلم لیڈر سر تیج بہادر سپرو کے خط مورخہ ۵ ار دسمبر ۱۹۳۸ کا ضروری اقتباس درج کرتا ہوں جو سکریٹری بزم اقبال آگرہ کو یوم اردو کی تقریب میں لکھا گیا اور اخبار ریڈر مورخہ ۶ ار دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ "زبان کو ہندی کیوں کہا گیا۔ یہ سوال تشریح طلب ہے اس کی وجوہ یہ ہیں کہ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کی ہر چیز کو جیسا کہ دستور ہے ہندی کہتے تھے جیسے تر ہندی (املی) تیغ ہندی (تلوار) وغیرہ وغیرہ جب اردو زبان رائج ہوئی تو اس قاعدے کے تحت اس زبان کو بھی ہندی کہا گیا۔ جب اس نئی زبان کے لئے کوئی نام نہ تھا اس وقت مجبوراً اس زبان کو زبان ہندی کہا گیا۔

۳۔ جب اور زبان کا نام ہندی نہ تھا تو اردو کو ہندی کہنے میں کیا ہرج تھا۔

۴۔ اس وقت مقامی بولیوں کے نام جداگانہ تھے جیسے مرہٹی، پنجابی، بنگالی، شمالی ہند میں جو پراکرت رائج تھی اس کا نام برج بھاشا تھا جو عربی الفاظ کے ملنے سے موجودہ اُردو زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی اور اہل ہند آپس میں جو گفتگو کے درمیان زبان استعمال کرتے تھے اس میں فارسی اور عربی الفاظ شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ زبان ہندی کہلائی۔

۵۔ قدیم مسلمانوں نے جس زبان کو ہندی لکھا ہے اس میں الفاظ اور فقرے ایسے بھی ہیں جو عربی، فارسی الفاظ سے آزاد ہیں۔ "پونوں کا چاند بالا ہے"

۶۔ تن کے دھونے سے دل جو ہوتا پوک
بش اور اصفیا کے ہووے خوک"
(بابا فرید)

" اس طرح اس میں ڈوب اے صابر کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے
(مخدوم صابر صاحب)

۶۔ شاہجہاں کے عہد میں نئی زبان کا نام اُردو پڑا۔ اس وقت بھی عام طور پر اردو زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ چنانچہ شاہجہاں کی ایک تحریر جو عالمگیر کو اردو زبان میں لکھی تھی۔ عالمگیر نے لکھا۔

آن فرمان عالی کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد این معنی است۔

۷۔ موجودہ ہندی زبان کا اٹھارہویں صدی کے آخر تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہندی زبان کی سب سے پہلی کتاب للو لال جی نے کلکتہ سے زیر اہتمام مسٹر گلکرائسٹ کے ایماء پر "پریم ساگر" کے نام سے ۱۸۰۵ء میں لکھی اور یہ موجودہ ہندی زبان کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔

انیسویں صدی سے اردو اور ہندی دو جدا زبانیں مختلف رسم الخط میں دوش بدوش ترقی پانے لگی اور دونوں علیحدہ ہو گئیں ایک کو دوسرے کے نام سے پکارنا غلط فہمی کا باعث ہونے لگا۔ نئی ہندی زبان وہ رہی جس میں سنسکرت الفاظ کی زیادتی ہو اور اردو زبان وہ قرار پائی جس میں الفاظ آزادی کے ساتھ استعمال ہوں اور رسم الخط جدا ہو۔

۹۔ اردو کی ابتدا ہونے سے انیسویں صدی تک اس کے مختلف نام بدلتے رہے۔ شاہجہاں کے زمانہ تک ہندی اور ہندوی کہلائی۔ اس کے بعد ریختہ نام پڑا جو غالب کے زمانہ تک رہا۔ جس میں وہ اردو شاعری شامل تھی جس میں فارسی کے مصرعہ اور ٹکڑے اردو شاعری کے ساتھ ملے ہوئے ہوں چنانچہ انیسویں صدی تک ریختہ کے نام سے پکاری گئی۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو اس کا نام بدل کر ہندوستانی رکھا اور یہ اردو اور ہندی دونوں پر صادق آتا تھا۔ چنانچہ امتیاز کی غرض سے تفریق کرنے کی ضرورت پڑی۔ انگریزوں نے اعتراضات کئے۔ مثلاً گارسان دتاسی نے جو خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء کو پیرس میں پڑھا اس میں کہا تھا کہ ہندوستانی زبان ہندو اور اسلامی شاخوں کا علم ادب صرف علیحدہ ہی نہیں بلکہ مختلف نوعیت کا بھی ہے۔ ہندی میں سنسکرت کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے موجود ہیں یا کم از کم ان کا تتبع کیا گیا ہے لیکن اردو اور دکنی میں ہے فارسی کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے اور ان کے نمونے دیکھتے ہیں۔ اب اردو ادب سے مراد خاص اردو زبان لی جاتی ہے۔

۱۰۔ لفظ ہندوستانی زبان کوئی معنی نہیں رکھتا اس میں ہندی اردو دونوں شامل ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانے ہندوستانی زبان میں نہیں بلکہ اردو اور ہندی میں جدا جدا ہیں اس طرح کسی وجہ سے زبانوں میں اردو زبان کو ہندوستانی میں مدغم کرنا یا ملا دینا اردو کو فنا کر دینا ہے۔

۱۱۔ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو اردو کی بنیاد اتحاد بین الاقوامی پر ہے یا مسلم سلاطین کی رواداری اور منصف مزاجی کا ثبوت ہے۔ حاکم اور محکوم حکمراں قوم کو

رعایا کی دلداری یا علاقائی زبان کی ہیبت افزائی اور اصلاح مقصود ہے کہ گھر پھونک تماشا دیکھا اپنی فارسی زبان کو اردو یا پراکرت (برج بھاشا) کے ساتھ خوش دلی سے ملنے دیا بلکہ فارسی کو اردو پر قربان کر دیا۔ محض اس وجہ سے کہ اردو ہندو اور مسلم دونوں کی مشترکہ ملکیت تھی اور ہندوستان کی تمام اقوام اردو کی ارتقا میں دلچسپی لے رہی تھی۔

اردو زبان کم و بیش چار یا پانچ سو برس سے ہندوستان میں موجود ہے اور ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آج اس اعلی درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی جو زبانیں جو سینکڑوں برس سے رائج ہیں۔ انگشت بدنداں ہو گئیں۔ ہر قسم کا لٹریچر اردو میں موجود ہے برعکس اس کے ہندی زبان کا سنگ بنیاد نفاق پر قائم ہے اور برطانوی سیاست تقسیم کرو اور حکومت کرو کا شاہکار ہے۔ یہ گلکرسٹ کے ایماسے اردو کے مقابل ہندو مسلم کے درمیان نفاق ڈالنے کے لئے شروع کی گئی ہے۔ ۱۸۰۳ء میں للولال جی کے ہاتھوں پریم ساگر نامی کتاب ہندی میں لکھوا کر اہل ہند کو اکسایا گیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اب کیا تھا منافرت اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔

(ص ۱۵ تا ۲۱ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عبادالله)

تیج بہادر سپرو کے حوالے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے یہاں کی ہر چیز کو ہندی کہا اور یہاں کے پیدا ہوئے مسلمانوں نے اپنا وطن ہندوستان کو مانا اور خود کو ہندی کہلانے میں فخر محسوس کیا جیسا کہ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اب میں چند مصنفین کی تحقیقات پیش کروں گا کہ ہندی صرف مسلمانوں کی زبان تھی یا اس کو ملی جلی آبادی استعمال کرتی تھی۔ سب سے پہلے میں ہندی ادب کے ایک ممتاز محقق ڈاکٹر اُدے نرائن کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

"اس پر کار ودیشی مسلمانوں نے بھارتیہ مسلمانوں کو ہندی کہا اور آگے چل کر ان کی بھاشا کا نام بھی ہندی پڑا۔ یہ وہی بھاشا تھی جس کا ہندو تتھا بھارتیہ مسلمان سمان روپ سے ویوہار کرتے تھے۔ خلکت (اختصار) کے ارتھ میں "ہندی" شبد مسلمانوں

کی دین ہے۔

(ص ۱۸۲۔ ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس)

ہندی لفظ ابتدا ہی سے یہاں کی زبانوں کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اہل عرب اور ایرانی ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں سے ہر ایک کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ وہ سنسکرت، پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی کہتے تھے۔ بزرگ شہریار کی روایت کے مطابق ۲۷۰ھ میں جس زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا گیا تھا اس کا نام مصنف نے ہندیہ بتایا ہے۔ اس طرح الفہرست جو ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے ہندوستان کی جس زبان سے عربی کتب کا ترجمہ ہوا اس بیان میں ہندوستان زبان کا نام ہندی لکھا گیا ہے۔

محمد بن قاسم کے حملے سے پیشتر پشاچی زبان دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک سندھ میں بولی جاتی تھی دوسری پنجاب میں مروج تھی۔ مسلمانوں نے ان دونوں بولیوں کو سندھی اور ہندوی نام دیا ہے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں جگہ علاحدہ قسم کے رسم الخط بھی مروج تھے۔ تاریخ معصومی میں صفحہ ۱۱ اور ۱۲ میں راجہ داہر کے والد چچ کے بارے میں لکھا ہے "کہ وہ سندھی اور ہندوی دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا اور دونوں زبانوں کے رسم الخط سے بھی واقف تھا۔"

شیخ فرید بھکری ۱۶۶۰ء نے زبان ہندی کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل کے حالات میں لکھا ہے۔ "ترجمہ عبارت اردو ہندی بفارسی نمود"

(ذخیرۃ الخوانین جلد اول)

یہ سنسکرت کے لئے ہندی کہنے کی ایک واضح مثال ہے۔ اس طرح عبدالحمید لاہوری نے برج بھاشا کو ہندی اور شاہ حاتم نے ہندوی کہا ہے۔

"زبان ہر دیار تا ہندوی کہ آں بھاکا گویند در قید نمود۔"

اردو بھی انیسویں صدی سے پیشتر ہندی کہلاتی تھی۔ صوفیا کرام اور شعراء ابتدا میں اسے ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ میاں گیسو دراز نے اسے ہندی کہا ہے اور

ترکی، عربی ہندوی بھاشا جتیں آد
جا مین مارگ پریم کاسے سارہے ۔ ۱۵

اب میں ایک اور ہندی ادب کے محقق سرگیہ پنڈت پدم سنگھ شرما ایم۔ اے کی مشہور تصنیف ہندی، اردو اور ہندوستانی" سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جس میں انھوں نے وضاحت سے ہندی لفظ کو اردو زبان کے معنوں میں استعمال کے بارے میں بیان کیا ہے۔

" بھارت میں اس بھاشا (اردو) کے جتنے نام پرچلت (مستعمل) ہیں ہندی ان سب میں پرانا ہے اس نام کی سرشٹی (ابتدا) ہندوؤں نے نہیں کی اور نہ انھوں نے اس کا پرچار کیا ہے۔ ہندو لیکھوں نے اس کے لئے پرانے بھاشا شبد کا ہی پریوگ کیا ہے۔ تلسی داس کہتے ہیں " بھاشا بھدر نتو رمت موری" لیکن تلسی داس جی نے پنچانگ میں ہندی لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ بھاشا کے لئے ہندی شبد کے سر پہ پر کھم نام کرن کا سارا شریے مسلمان لیکھکوں اور کویوں ہی کو دیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کا اس میں ذرا بھی ہاتھ نہیں ہے۔ اس بات کو آدھنک اردو اتہاس کے لیکھکوں نے سیوکا کر لیا ہے۔ اردوئے قدیم تاریخ نثر اردو و پنجاب میں اردو کے اتہاس لیکھکوں کے ودان لیکھکوں نے بڑی کھوج کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا سب سے پرانا نام ہندی ہی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری میں (جو اردو ہندی کا سب سے پرانا کوش ہے) سب جگہ ہندی یا ہندوی ہی آیا ہے۔ اس میں اردو ریختہ وا دو کسی دوسرے نام کا کہیں اولیکھ نہیں ہے۔ خالق باری میں بارہ بار ہندی اور پچیس بار ہندوی شبد کا پریوگ ہوا ہے۔ ہندی کا ارتھ ہند کی بھاشا اور ہندوی سے مطلب ہندوؤں کی بھاشا یا ہندوستان کی بھاشا۔ ان دونوں شبدوں میں یائے نسبتی (سمبندھ واچک) ہے یہ تو صاف ہی ظاہر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر خسرو کے اس ہندوی شبد سے یہاں کسی کو یہ بھرانت نہ ہونا چاہیئے کہ جاتی وشش کیول ہندوؤں ہی کی بھاشا سے انکا مطلب ہے۔ کوی ورد (شاعر) سودا کے استاد شاہ حاتم نے ۱۷۵۰ء میں ہندی یا ہندوی

شبد ہندوستان کی بھاشا کے ارتھ میں استعمال کیا ہے۔ یہاں ہندو شبد ہند کے نواسی ارتھ کا بودھک ہے (معنی دیتا ہے) بھارت کی کس جاتی وشیش کا نہیں اب تک امریکہ فارس آدی دیشوں میں ہندوستانی ماتر کو (جا ہے وہ مسلمان (ہندو عیسائی) ہو ہندو ہی کہا جاتا ہے۔ وچار کرنے پر اس میں کسی پرکار کا سندیہ (شبہ) کا اوکاش نہیں رہ جاتا کہ ہماری بھاشا کا سب سے پرانا و پاپک (مشہور) اور بھوویہ بہت نام ہندی ہے اور مسلمان لیکھک (مصنف) ہی اس نام کے نرماتا (معمار) اور پرچارک (مبلغ) ہیں۔ آتش نے جو اس دور کے شاعر ہیں جب اردو زبان منجھ چکی تھی۔ (متروکات سے پاک ہو کر خالص اردو بن چکی تھی) اردو کے لئے ہندی کا نام ہی استعمال کیا ہے۔

مطلب کو میرے یار نہ سمجھے تو کیا عجب
سب جانتے ہیں ترک کی ہندی زباں نہیں
(آتش)

اردو کے آدھنک آچاریہ انشا نے اپنی تصنیف "دریائے لطافت" میں کئی جگہ ہندی شبد کا بھی پریوگ اردو کے ارتھ میں کیا ہے۔ تتھا (علاوہ) دریائے لطافت میں دوبار ہندی شبد آیا ہے۔ سودا کے سم کالین (سودا کے دور کے) اور مدراس پرانت ویلور کے نواسی باقر آگاہ نے ۱۱۵۱ھ میں اپنے دیوان کا نام دیوان ہندی رکھا۔ ان کے سمبندھ میں محمد عبد القادر سروری ایم۔ اے۔ ایل جی۔ نے لکھا ہے کہ دیوان کے سرورق (ٹمٹہ پرشٹ) پر اور خود اشعار میں بھی کہیں کہیں ہندی کا ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ان شعراء کی اردو ہوتی تھی کیونکہ وہ اردو کو ہندی سے کوئی جدا چیز نہیں سمجھتے تھے۔ آگے لکھا ہے "ہندی یا ہندوی اس کا قدیم ترین نام تھا۔ اردو کے لئے دکنی لفظ بھی بلا تکلف استعمال ہوتا تھا۔ گویا اردو ہندی اور دکنی ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے۔ اس زبان کی شاعری ریختہ کہلاتی تھی کوتی حمت نے اپنی مثنوی "حسن دعشق"

میں اُردو کے لئے ہندی شبد استعمال کرتے ہیں۔

کہ ایک قصہ سنا دے کوئی مغموم
تو اس کو کیجئے ہندی میں منظوم

صفحہ ۱۶ پر شاہ حاتم اپنے دیوان زادے کے دیباچے میں لکھتے ہیں

"میں نے تحریر کے تئیں جو زبان اختیار کی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں کی زبان ہے یعنی ہندوی جسے بھاکا کہتے ہیں کیونکہ عام لوگ بخوبی سمجھتے ہیں اور بڑے طبقے کے لوگ (بھدر دمیتی) بھی پسند کرتے ہیں۔ (فرخ دودان کا رسما دتاسی کے پانچویں بھاشن سے)

(صفحہ ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹ ہندی اردو اور ہندوستانی)

اس مفصل بیان کے بعد میں شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن "موضع قرآن" کے دیباچہ کے بطور سند پیش کرتا ہوں۔ یہ موضع قرآن ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا۔ جس میں موصوف نے اردو زبان کو ہندی سے تعبیر کیا ہے۔

"اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی برجستہ فارسی گو گئے ہیں متخل و آسان اب ہندی" میں قرآن شریف کو ترجمہ کرے الحمدللہ کہ میں میسر ہوا۔" (اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری)

موجودہ صدی میں بھی اُردو کو ہندی کہا جاتا رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اُردو کو ہندی کہا ہے ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیریں تر است
اسرار خودی

ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی فرماتے ہیں کہ " اردو کا نام ہندی (قدیم ہندی)، ہندوستانی اور اُردوئے مقابلے میں زیادہ قدیم

ہے۔ (ص ۱۷۱۔ انڈو آرین اینڈ ہندی)

پروفیسر شیرانی کا ارشاد ہے کہ "اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ آخر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُردو کے لئے ہندی لفظ خسرو سے لے کر غالب سرسید اور اقبال کے وقت تک کسی نہ کسی شکل میں مستعمل نظر آتا ہے۔

اُردو لفظ کا تاریخی اور تحقیقی جائزہ

یہ بات تو عام طور پہ سب ہی کو معلوم ہے کہ "اُردو" ترکی زبان کا لفظ ہے
اور یہ زبان جو دنیا کی ایک اہم زبانوں میں گنی جاتی ہے اور اس کے بولنے
والے روس چین اور ترکی جمہوریہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ترک قوم بھی بحر روم
کے ساحل سے لے کر چین اور روس کے وسیع میدانوں اور پہاڑوں میں بسی
ہوئی ہے اور ایک عظیم تاریخ کی حامل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم ترکی زبان میں "اردو" کی معنوی حیثیت
کیا تھی اور بعد میں اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ لیکن ترکی زبان کا قدیم
ادبی سرمایہ ماضی کے پردے میں نہاں ہے۔ آثار قدیمہ کی کوششوں سے چھٹی
صدی عیسوی کے کچھ کتبے منظر عام پہ آچکے ہیں۔ ان کتبوں میں بھی اردو لفظ موجود
ہے۔ اور جو لشکر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

امیر علاءالدین جوینی کی تاریخ جہاں کشا اور وزیر رشید الدین فضل اللہ
کی جامع التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے زمانہ
میں مغل بادشاہوں اور شاہزادوں کے فرودگاہوں اور لشکر گاہوں
کو "اردو" کہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا مستقر حکومت بھی "اردو"

طلا تا تھا اور قراقرم قدیم کا نام "اردو بالغ" تھا

(صفحہ ۴۱۔ تاریخ جہان نکشان جلد اوّل

دوسری جگہ تحریر ہے کہ چنگیز خاں کی اولاد جس نے روس کے ایک وسیع حکومت قائم کر لی تھی۔ اُن کے سنہرے خیموں کی وجہ سے ان کی لشکر گاہیں اردو مطلا کہلاتی تھیں، اور خود انھیں اردو مطلا کے نام سے شہرت ہو گئی تھی۔ (ص ۴۳ جامع التواریخ)

تاریخ وصاف جلد اول میں اردو لفظ لشکر کے معنوں میں موجود ہے۔ "ہلاکو خاں بر معیار مقرر و زماں منتظر مطالع مسعود نوید اقبال بوعود اردو خود آنکہ حرکت آمد"۔

جامع التواریخ میں بھی ص ۱۸ میں تحریر ہے۔ "پیشتر ازاں کہ خاقان بر تحت نشست ہم در سال کہ وفات چنگیز خاں بود شہزادگان و امراء کہ در اردوئے چنگیز خاں ماندہ وکنگاکردہ"۔

اس زمانے میں ترکی زبان "خون اور اورادیغور یا ذی" رسم خطوں میں لکھی جاتی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں ترکوں میں اسلام کے بڑی تیزی سے پھیلنے اور ترکی زبان کا رسم خط" اورخون "اور ادیغور یاری" کی جگہ عربی ہو گیا یغور ترکوں کی اکثریت نے عربی رسم خط اختیار کر لیا تھا۔ یہ رسم خط سلطان محمد فاتح ۱۴۵۱ تا ۱۴۸۱ اور ظہیر الدین بابر ۱۴۸۳ء تا ۱۵۳۱ء تک جاری رہا۔ اس دور میں عوامی رسم خط میں اس لفظ کے "اردو" اور "ردو" دو املا نظر آتے ہیں۔ یہ اختلاف ترکی زبان کو عربی رسم خط میں لکھنے کی وجہ سے ہوا اور کافی عرصہ تک رہا لیکن اب ہر جگہ "اردو" املا لکھا جاتا ہے۔ اس دور میں اردو لفظ سلاطین کے دائرہ حرم کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

ترکوں کے مسلمان ہونے کے بعد دو اہم کتابیں لکھی گئی تھیں اور یہی اسلام لانے کے بعد ترکوں کی سب سے پہلی تصانیف بھی سمجھی جاتی ہیں۔ ان سے

پہلی کتاب کا نام "کوتادغو" (قوتادغو) بلیگ ہے۔ اس میں اردو لفظ بادشاہ کا خیمہ اردوگاہ اور شاہی کوشک کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب ایک ترکی لغت ہے اس کا "دیوان لغت الترک" ہے جسے محمود بن حسین محمود کاشغری نے مرتب کیا ہے۔ اس لفظ "اردو" کے معنی خاقان کے قیام کرنے کا شہر جو ہے کابل اور گھونسلا ہیں۔ محمود کاشغری نے اس لفظ کے تین مرکب لفظ بھی لکھے ہیں۔ اُردو باشی جس کے معنی خاقان کا بستر وغیرہ درست کرنے والا شخص تحریر ہے۔ دوسری مثال "اردو لالمناک" یہ معنی آباد ہونے کی ہے۔ تیسری مثال "اردوچی جس کے معنی فوج کے کمانڈ کرنے والے خاقان کے ہیں (رسالہ فکر و نظر شمارہ ۴۲) جلد ۱۰ ۱۹۷۰ء

چغتائی ترکی زبان میں "اردو" سے متعلق دو مزید الفاظ بھی ملتے ہیں۔ پہلا "اردو" ہے جس کے معنی خادمان سلاطین و اکابر کے ہیں۔ دوسرا لفظ اردو بگی اور اُردو بگینی ہے جس کے معنی آغائے حرم یا محافظ حرم اور ناظر حرم کے ہیں۔ اردو بگینی کا عہدہ مغلیہ حرم میں بھی تھا جس کے لئے مرد اور عورت الگ الگ مقرر کئے جاتے تھے اس کا ذکر مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے بھی "تاریخ ہندوستان" جلد ۲ ص ۱۷ پر کیا ہے۔ "بی بی فاطمہ مغل بادشاہ ہمایوں کی حرم میں اردو بگینی تھیں۔"

خرغیز اور قازاق ترکی لہجوں میں بھی اُردو لفظ موجود ہے۔ اس لہجہ کی لغت میں اُردو کے معنی، قرارگاہ خان (غار) سانپ کا بل اور ایک قسم کا کھیل۔ ایک صف یا فرقہ اور سفید خیمہ کے ہیں۔ لفظ اردو بمعنی مقام اور جگہ بھی مستعمل نظر آتا ہے۔ موجودہ ترکستان جہاں یہ ترکی زبان پیدا ہوئی وہاں اب یہ لفظ مفقود ہے چینی ترکستان کی ترکی زبان میں لفظ "اردو" سرائے کوشک اور بادشاہ کے خیمے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ افغانستان اور ایران کے بعض ترکی علاقوں میں۔ البتہ اردو لفظ لشکر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور

میں بھی ترکی جمہوریہ کی فوج "اردو" کہلاتی ہے۔ استنبول کی ایک سڑک کا نام "اردو جادہ سی" مشہور ہے۔ بحر اسود کے ایک ساحلی صوبہ کو آج بھی اردو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ترکی جمہوریہ اپنی بری فوج کو کارہ (قرا) اردو سو ہوائی فوج کو اردو سما اور بحری فوج کو دلنز (دکنز) اردو سو کہتی ہے۔ وہ لوگ اردو گاہ ملٹری کیمپ کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں اور فوجی کلب کے لئے وہاں "اردو ایوی" بولا جاتا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں اردو لفظ کب سے مستعمل ہے۔ تاریخی حقائق تلاش کرنے پر "طبقات ناصری جو ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۸۰ء میں بعہد سلطان ناصر الدین محمود تصنیف ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اہل ہند مغلوں کے لشکرگاہ کو "اردو" کہا کرتے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں بھی اردو لفظ موجود ہے۔

" دربردو لشکر احساد مختلف مذکوری شد کہ خواجہ جہاں بران قرار دکہ چوں لشکر سلطان دہلی اسد آمد کہ درا اردوئے ظفر قرین آمد اتباع آنہار ادر منجنیق نہادہ خواہد انداخت"

شہنشاہ بابر نے ۹۳۲ء میں ہندوستان فتح کیا۔ دہلی اور آگرہ کی تسخیر کے بعد ۹۳۳ میں جو فتح نامہ اطراف و اکناف روانہ کئے۔ ان میں اپنے لشکرگاہ کو "اردوئے نصرت شعار" کے لقب سے موسوم کیا ہے۔

(بابر نامہ۔ ص ۲۱۴۔ طبع قازان)

شاہان مغلیہ کے زمانہ میں شاہی لشکرگاہ کو اردوئے معلیٰ کہتے تھے۔ اور بازار لشکر کو بازارِ اردو یا اردو بازار کہتے تھے۔ (طبقات اکبری ص ۲۱۷) سلاطین تیموریہ کے درباری مورخ جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں گزرے ہیں لفظِ اردو کو شاہی فرودگاہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ (طبقات اکبری ص ۲۱۵ - ۲۱۶) اقبال نامہ جہانگیری میں ص ۲۷۰ پہ جہانگیر نے سفر کشمیر کے

رستے میں جو سکہ بنوایا اس پر یہ شعر کندہ ہے۔

باد روان تا کہ بود مہر و ماہ
سکہ اردوئے جہانگیر شاہ

تاریخ فرشتہ میں بھی اردو لفظ شاہی فرودگاہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔
(تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۷۷)

اردو بازار کا لفظ ہمیں سلاطین خلجیہ کے دور میں بھی ملتا ہے۔ تاریخ ہندوستان مصنف مولوی ذکاء اللہ میں تحریر ہے: ۷۰۹ ہجری مطابق ۱۳۱۲ء میں ملک کافور کو دوبارہ دیوگڑھ کی راہ سے وارنگل پر یلغار کرنے کے لئے سلطان علاء الدین خلجی نے روانہ کیا۔ جب فوج دیوگڈھ آئی تو راجہ رام دیو نے استقبال کیا اور لشکر میں اپنا اردو بازار بھجوادیا اور تاکید کردی کہ نرخ شاہی کے موافق اجناس فروخت ہوں۔ (ص ۷۰ — ۷۱)

اردو بازار دہلی میں بھی تھا جس کا تذکرہ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید اور غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ ہندوستان میں یہ لفظ شروع شروع میں لشکر اور بازار کے لئے استعمال ہوا لیکن زبان کے معنوں میں اردو لفظ کا استعمال کب سے ہوا یہ ایک الگ سوال ہے۔ اس معاملہ میں کچھ لوگ اردو لفظ کے زبان کے معنوں میں استعمال کو اپنے ذاتی جذبات کے تحت قدیم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اس لفظ کا انیسویں صدی سے بیشتر زبان کے معنوں میں مستعمل ہونے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ دو ایک جگہ پایا بھی گیا تو تحقیق کرنے پر اس کی موجودگی مشکوک نکلی۔ حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ایک مثال "مویدالفضلاء" سے ضرور پیش کی ہے، مویدالفضلاء فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے قبل سلطان ابراہیم لودی کے عہد میں تحریر کی گئی تھی۔ اس کتاب میں ایک مقام پر تحریر ہے "در زبانِ اہلِ اردو خون خدا یا گویند" لیکن اس جملہ کے اصل ہونے پر حافظ شیرانی کو اعتراض ہے۔

اور انہوں نے اصل نسخہ سے ملا کر ثابت کیا ہے کہ نولکشور پریس کے کاتب یا نقل نویس کی غلطی ہے جس نے اس جملہ کے علاوہ اور بھی بہت سی تبدیلیاں اس کتاب میں کی ہیں جو اصل نسخہ میں کہیں نہیں ہیں۔ عہد مغلیہ میں اس زبان کو ہندی کہا جاتا تھا یہ بات عالمگیر کے ایک خط سے بھی ظاہر ہے اور بعد میں اس کو ریختہ کہا گیا

اٹھارہویں صدی کے آخر میں تنہا اردو لفظ زبان کے معنوں میں مصحفی کے یہاں ملتا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میرو مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ڈاکٹر جمیلی کا قیاس ہے یہ شعر ۱۷۹۰ء میں کہا گیا ہے لیکن یہ قیاس تو قیاس ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس شعر جس ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کے شعراء میں لفظ عام تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان کے ہم عصر شعراء اور مصنفین میں سے کسی نے ۱۸۰۰ء سے قبل اردو لفظ تنہا زبان کے لئے استعمال نہیں کیا۔ مصحفی نے خود اپنی تصنیف جس میں اردو شعراء کا تذکرہ ہے کا نام "تذکرہ ہندی گویان" رکھا۔ پھر انھوں نے اس زبان کو اپنے ایک شعر میں ہندوی کہا ہے۔

مصحفی فارسی کو طاق میں رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

اس شعر اور ان کی تصنیف کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت "اردو" لفظ تنہا زبان کے معنوں میں رائج نہ تھا اور نہ عام تھا۔ ورنہ وہ اشعار ہندوی کی جگہ شعر اردو کہتے اور کتاب کا نام تذکرہ اردو گویان رکھتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے بالکل شروع میں فورٹ ولیم کالج کی کچھ تصانیف کی بدولت اردو لفظ بھی تنہا زبان کے معنوں میں چلنے لگا ہو۔ اس وقت یہ شعر

مصحفی نے کہا ہو کیونکہ مصحفی ۱۸۲۴ء تک زندہ رہے۔

ڈاکٹر بلوکس بلاک صرف فردِ واحد ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں
کہ یہ لفظ انگریزوں کی دین ہے۔ وہ اس صداقت کو ماننے سے انکار نہیں کرتے۔
ڈاکٹر بیلی اور کسی اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ جب
ہی سے اُردوئے معلیٰ کے بجائے زبان کے معنی میں تنہا اردو لفظ کا رواج پایا جاتا
ہے۔ جب سے ڈاکٹر گلکرائسٹ ہندوستانی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں
اس لئے اُردو محققین کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت اس زبان
کا واحد نام کوئی نہ تھا۔ تنہا "اردو" نام کے رواج دینے میں فورٹ ولیم کالج کا
زبردست ہاتھ ہے۔ ۱۷۹۷ء میں سید عطا حسین تحسین نے قصہ چہار درویش
کا ترجمہ "نوطرز مرصع" کے نام سے کیا تھا۔ اس میں اُردو زبان کے لئے ریختہ، ہندی
زبان، اردوئے معلیٰ یہ تین نام ایک ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف تنہا اردو
لفظ اگر اس زمانے میں عام ہو گیا ہوتا۔ جیسا کہ مصحفی کے مندرجہ بالا شعر سے
معلوم ہوتا ہے تو تحسین صاحب تین نام استعمال کرنے کے بجائے صرف ایک نام
اردو یا زبانِ اُردو ہی استعمال کرتے۔ انگریز مصنفین نے مستقل طور پر عام ملکی
زبان کے لئے ہندوستانی، انڈوستانی لفظ کا استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر فیلن Fallon
نے اپنے گرامر کا نام ہندوستانی گرامر رکھا۔ گلکرائسٹ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج
میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ تب انہوں نے متعدد اُردو کی گرامر اور لغت تصنیف
کیں۔ اردو کے لئے ہر جگہ ہندوستانی ہی لکھا ہے۔ ڈنکن فاربس اور
مشہور فرانسیسی مشرق گارساں دتاسی نے بھی اُردو کے بجائے ہندوستانی
لفظ استعمال کیا ہے۔

اردو لفظ [1] زبان کے معنی میں مستعمل نہ ہونے کے بارے میں میر امن
اور میر علی حسین کا مندرجہ ذیل بیانات اس کے واضح ثبوت ہیں جو انہوں نے
باغ و بہار کے دیباچہ میں تحریر کئے ہیں۔ "جان گلکرائسٹ صاحب نے ہیشت

---

[1] اردو کا لفظ بطور زبان سب سے پہلے مصحفی نے ۱۷۷۲ء میں استعمال کیا۔ بحوالہ [illegible] اُردو، کراچی

اقبال الٰہ کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے کس لطف سے فرمایا " اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان مرد عورت لڑکے کے بالے خاص و عام آپس میں بولتے ہیں ترجمہ کرو۔ (دیباچہ ص ۲)

بالکل ہو بہو یہی الفاظ محترم ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو ہائیڈل برگ جرمنی کی لائبریری میں ملنے والے " نثر بے نظیر " کے مخطوطے کے حاشیہ پر بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ یہ مخطوطہ دراصل میرحسن کی مثنوی سحر البیان کا نثری روپ ہے اور میر علی حسین نے مخطوطہ کے حاشیہ پہ اپنے قلم سے یہ تحریر لکھی ہے " جان گلکرائسٹ نے کس لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان مرد عورت، لڑکے، بالے، خاص و عام آپس میں بولتے ہیں ترجمہ کرو۔ دونوں کتب کے دیباچے کے ان الفاظ کی یکسانیت دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ دونوں نے یا تو مل کر یا پاس بیٹھ کر یہ جملہ لکھا ہے یا یہ جملہ دونوں کو لکھ کر دیدیا گیا تھا اور دونوں نے اس کی نقل کتابوں میں کی ہے۔ اس اقتباس پر ڈاکٹر موصوف کی ذاتی رائے جو انھوں نے دی ہے جس کا ذکر میں اپنے ایک اور مضمون میں بھی کر چکا ہوں جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اس اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔

۱۔ اردو زبان کا نام اس دور میں ہندوستانی یا ہندوی یا ہندی تھا۔

۲۔ یہ زبان اس وقت ہندو مسلمان دونوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔

۳۔ اردو لفظ لشکر یا شہری آبادی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

۴۔ یہ زبان گفتگو کی زبان تھی اور اس کا چلن محض کتابوں یا دفتری نہ تھا۔

میر امن باغ و بہار کے دیباچہ میں اُردو لفظ کو متضاد طریقوں سے استعمال کرتے ہیں "۔ حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے

اور مندرجہ بالا اقتباس میں جان گلکرائسٹ نے کس لطف سے فرمایا " اور ایک موضع میں لکھتے ہیں ۔ اردوئے معلی کی زبان میں باغ و بہار بنایا اور یہ شعر بھی تحریر فرماتے ہیں " ؎

سو اردو کی آراستہ کر زبان

کیا میں نے بنگالہ ہندوستان

ان اقتباسات سے مولانا شیرانی کی اس بات کی تائید ہوتی ہے ۔ میر امن نے مرزا اتشین کی نو طرز مرصع سے اُردو زبان کا لفظ لیا ۔ نہیں تو وہ نا اردو لفظ کے زبان کے معنوں میں استعمال سے ناواقف تھے ۔ یہ بات بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس وقت اس زبان کے لئے تنہا اردو لفظ نہیں بولا جاتا تھا ۔ اس وقت یہ زبان ہندی ہندوی ہندوستانی کھڑی بولی اور اردوئے معلی کہلاتی تھی ۔ میر تقی میر نے نکات الشعراء ۱۷۵۲ء میں اس زبان کو اردوئے معلی شاہجہاں آباد دہلی کے نام سے یاد کیا ہے ۔ لکھتے ہیں یہ بات پوشیدہ نہ رہنا چاہیے کہ فن ریختہ میں جو فارسی شعراء کی طرح اردوئے معلی شاہجہان آباد دہلی کی زبان میں شعر کہنے کا ایک انداز ہے کوئی کتاب اس وقت تک نہیں لکھی گئی ۔

(تذکرہ میر ۵۳ ص)

میر صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں دو باتوں کا پتہ ملتا ہے کہ اردوئے معلی ایک مقام یا تشبیہی نام تھا ۔ دوسرے اردوئے شاہجہان آباد کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی ۔ اس کی توثیق ڈاکٹر بیلی نے بھی کی ہے لکھتے ہیں " کہ ہو سکتا ہے کہ اردوئے معلی سے مراد میر کی فصیح اور مستند اردو زبان ہو جو میر کے خیال میں قلعہ معلی کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی اگر انکی مراد شستہ اور رفتہ زبان سے ہوتی تو وہ زبان قلعہ معلی کہتے (از جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ص ۳۳۴ ۱۹۳۰) یہی بات ہندی ادب کے محقق اور ہندی اردو ہندوستانی کے مصنف پنڈت پدم سنگھ شرما جی کہتے ہیں ۔

جس پرکار انگریزی بھاشا کے لئے پارلیمنٹ کی بھاشا آدرش مانی جاتی ہے اس طرح اردو کو تیا (شاعری) کے لئے آدرش دہلی کی زبان مانی گئی ہے سید انشا نے تو سارے دہلی کی بھاشا کو بھی فصیح اردو یا اردوئے معلی نہیں انا۔ اردو معلی یا قلعے کے آس پاس کی بستی کے کچھ گنے چنے محلوں کی پھر ان میں کچھ خاص لوگوں کی جو دہلی کے قدیم باشندے شریف اور نجیب (جن کے ماں باپ دونوں دہلی کے باشندے ہوں) ان کی بھاشا کو اردو مانا ہے۔ دہلی میں باہر کے لوگ ادھر ادھر سے آکر بس گئے ہیں ان کی بھاشا کو بھرشٹ یا ٹکسال سے باہر کی زبان کہا ہے۔ (ہندی، اردو، ہندوستانی ص ۱۰۹)

جب ولی دکنی دکن سے دلی آئے اور انہوں نے اپنی دکنی زبان کی شاعری دلی میں سنائی تو شاہ سعد اللہ گلشن نے انھیں مشورہ دیا کہ دکن کی زبان چھوڑ کر اردوئے معلیٰ میں شاعری کریں۔" زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید"۔ مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں قائم چاندپوری نے لکھی اس میں بھی قائم چاندپوری نے لکھا ہے:" اکثر از ترکیبات فارسی کہ موافق محاورہ اردوئے معلیٰ مانوس گوش باشد من جملہ جو از البیان دانند" میر کے موزون طبع صاحبزادے عرش کا ارشاد ہے۔

ہم ہیں اردوئے معلیٰ کے زباں داں اے عرشؔ
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں

مندرجہ بالا حوالاجات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں اردو لفظ کے معنوں میں اردوئے معلیٰ بولا جاتا تھا جو حاشیہ طور پر تھا اور اردوئے معلیٰ دہلی میں خاص خاص مقامات پر اور قلعہ معلیٰ میں بولی جانے والی زبان کا نام تھا اور یہاں کی زبان بہ نسبت اور دوسرے اردو بولنے والے علاقوں سے مستند اور بہتر سمجھی جاتی تھی اتنے پر بھی کچھ لوگ بہ ضد ہیں کہ انگریزوں سے پہلے ہی اردو لفظ زبان کے معنوں میں مشہور ہو چکا تھا جب کہ حقیقت اس کے

خلاف ہے۔ شاید یہ اُن کی اُردو کے نام سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے ڈاکٹر شوکت سبزواری اُسے خانِ آرزو کے یہاں موجود ہونا بتاتے ہیں لیکن وہ بھی "زبانِ ہندیٔ اہلِ اردو" کی اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جناب ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نظر نے بھی مجھے نواب آصف الدولہ کے عہد کے ایک شاعر محشر کا ایک شعر سنایا، وہ یہ ہے۔ ع

گفتگو اردو زبان کی کوئی ہم سے سیکھ لے
کیا جدا محشر اگر دلی کی پیدائش نہیں

شاعر موصوف نواب آصف الدولہ کے عہد میں قتل بھی ہو چکے تھے۔

مولانا عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ پنجاب کے شاعر مراد ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۳۷ء ان پہلے حضرات میں ہیں جنھوں نے اردو لفظ زبان کی معنی میں استعمال کیا۔ (خطبات ص ۳۰۵) لیکن زیادہ تر محققین اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ لفظ سب سے زیادہ مصحفی کے یہاں دیکھا گیا۔ ڈاکٹر شیرانی تنہا اردو لفظ کے زبان کے معنی میں استعمال کی عمر سوا سو سال بتاتے ہیں۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر بیشتر اصحاب جن کے اقتباسات میں آئندہ سطور میں پیش کروں گا۔ اس رائے سے متفق ہیں کہ تنہا اردو لفظ زبان کی معنی میں بعد میں آیا۔ ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نظر کے ارشاد سے اختلاف کی میں جرأت میں نہیں کر سکتا یہ تو ممکن ہے کہ اردوئے معلیٰ نام کے تعلق سے اختصار کے طور پر ایک دو مصنفین نے یا شعرا نے اردو لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہو لیکن اس میں شاید ہی شبہ کیا جا سکے کہ اس نام کا رواج دینا اور تنہا اس زبان کے لئے میں مستند کرنا فورٹ ولیم کالج کے ارباب ادب کا کام تھا۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردوئے معلیٰ کئی لوگوں نے اردو زبان کیلئے استعمال کیا ہے وہ اس طرح جیسے انگلینڈ میں پارلیمنٹ کی زبان کو مستند اور فصیح سمجھا جاتا ہے۔ انگلستان میں لندن کو اتفاقات نے دارالسلطنت بنا دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی انگلستان میں بولی جانے والی انگریزی کو اتنی اہمیت

دی گئی کہ وہی کلاسکی زبان کی بنیاد بن گئی۔ اس کے برعکس شمالی انگلستان کی انگریزی جو ایک زمانے میں صرف بول چال میں ہی نہیں بلکہ ادب میں بھی اس کی حریف رہ چکی تھی۔ اب قریب قریب مکمل گمنامی کا شکار ہو گئی ہے۔ اسی طرح انجیل مقدس کے اس ترجمے نے جو مارٹن لوتھر نے جرمنی کی سیکسنی بولی میں کیا جس نے اس بولی کو ادبی طرز نگارش بنا دیا۔ اس طرح ہندوستان میں دکن، گجرات، لکھنؤ، آگرہ میں بولی جانے والی زبانوں کے مقابلے میں دہلی کے اردوئے معلیٰ کی زبان کو ان زبانوں سے زیادہ مستند اور فصیح سمجھا جاتا تھا اور دہلی کے لوگوں کی زبان کو خاص طور پر ترجیح دی جاتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے اس زبان کا کوئی مخصوص ایک نام نہ تھا اسے زیادہ تر ہندی، ہندوی، ریختہ، کھڑی بولی اور کبھی کبھی اردوئے معلیٰ کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ یورپین لوگ اسے ہندوستانی کہتے تھے۔ لیکن جب فورٹ ولیم کالج کھولا گیا تو اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط میں بھی کتابیں لکھوائی گئیں (ڈاکٹر گل کرائسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۹۳ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

"۱۲ جنوری ۱۸۰۱ء کی رپورٹ کے مطابق فورٹ ولیم کالج میں گیارہ کتابیں چھپ چکیں تھیں یا چھپ رہی تھیں۔ ان میں چھ کتب ناگری رسم الخط میں تھیں جنوری ۱۸۰۲ء کو گل کرائسٹ سے کالج کونسل کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ فارسی اور ہندوستانی شعبوں (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی شعبے میں صرف اردو ہی نہ تھی) کے طالب علموں کی اعانت کے لئے جس طرح خوشنویس مقرر کیا گیا ہے جو سو روپیہ ماہوار پاتا ہے۔ اسی طرح ناگری رسم الخط کے لئے ایک خوشنویس کا تقرر کیا جائے۔ اس وقت ناگری نویس کو بیس روپیہ مہینہ دیا جاتا تھا اس اعتبار سے اس (ناگری خوشنویس) کو پچاس روپیہ ماہوار بہت زیادہ نہ تھے۔ ۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل نے ہندوستانی شعبے کے عملے کی جو منظوری دی تھی اس میں شری للو لال کب کو بھاکا منشی ۵۰ روپیہ ماہوار

پر مقرر کیا گیا۔ (گلکرائسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۵۸۔ ۱۵۹) عتیق احمد صدیقی

واضح رہے کہ گل کرائسٹ نے پہلے پہل برج بھاشا میں کتابیں لکھوانے

کی کوشش کی لیکن جب وہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی تو اردو کو ناگری رسم الخط

میں لکھوایا گیا جس سے ہندوستانی شعبہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا کیوں کہ

ہندوستانی شعبہ میں زیادہ منشی شمالی ہندوستان کے تھے جنھیں اردوئے معلی

کے طرز پر ہندوستانی میں کتب لکھنے کی ہدایت تھی۔ جس کا ذکر میر امن اور

علی حسنی نے باغ و بہار اور نثر بے نظیر کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اوّل اوّل تو

کالج میں فارسی رسم خط میں لکھی جانے والی زبان کو اردوئے معلی کہا گیا پھر ہر

وقت کے کثرت استعمال سے صرف اردو ہی رائج کر دیا گیا۔ اس طرح

ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان کو ابتدا میں بھاکا، ناگری بھاکا یا

کھڑی بولی کہا گیا۔ کیونکہ اس وقت اردو کو ہندو لوگ کھڑی بولی

کہتے تھے اور بعد میں یہ نام صرف ہندی رہ گیا۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ " دی ہندی

اسٹوری ٹیلر جلد ۲ میں کہتے ہیں " ان میں بہت سی کہانیاں کھڑی بولی یا ہندوستانی

کے خالص ہندوانہ اسلوب میں لکھوائی گئیں اور کچھ برج میں۔

(ہندی بھاشا کا وکاس ص ۱۵)

یہ حقیقت ہے کہ گل کرائسٹ نے ارادتاً ناگری رسم الخط میں کتابیں لکھوا کر

ہندوستانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ بعد میں انگریزوں نے اپنے سیاسی

مفاد کے لئے اسے استعمال کیا جس کا مختصر ذکر میں آئندہ باب میں کروں گا۔

اردو نام کے تنہا رواج میں آنے کی بات اس طرح ہوئی جس طرح چھوٹے بچے

کو پیار کے ناموں جیسے للو، منو، چھوٹے وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن نام

کرن ہونے کے بعد یا اسکول میں نام اندراج ہونے کے بعد اس کے سب نام

بھلا دیئے جاتے ہیں صرف ایک ہی نام رہ جاتا ہے اور بچہ رجسٹر میں لکھے

ہوئے نام سے پکارا جاتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو نام زیادہ

۱؎ گرلسین کو لسانی تقسیم نے کھڑی بولی کے ہندوانہ اسلوب اور مسلمانوں کا ... نام کو ہندی کا نام دیا۔

پانے کے بعد آہستہ آہستہ عوام اور سرکاری دفاتر میں یہی نام رائج ہو گیا اور اس کے سبب نام ترک کر دیئے گئے اور لسانی انگریزی ڈپلومیسی کے طفیل ابھارے ہوئے منافرتی جذبات نے اس نام کو اور بھی مستند کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا ہندوستانی کا دو حصوں میں تقسیم کرنے اور انھیں دو نام دینے میں زبردست ہاتھ تھا۔ میرے خیال میں یہ صحیح ہے کہ فورٹ ولیم کالج قائم نہ ہوتا اُردو کی ترقی میں کچھ دیر تو ضرور ہوتی لیکن دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتی۔ اس مختصر سے مضمون میں اس موضوع پر پوری طرح انگریزی ڈپلومیسی پہ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ آئندہ اگر حیات باقی رہی تو اس موضوع پر الگ ایک کتاب تحریر کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس زبان کے اُردو نام کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اس طرح فرماتے ہیں۔

"یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے اب تک اس زبان کا نام اردو سننے میں نہیں آیا۔ حالانکہ ہم نے آج اس کے نام کے سوا اور سب نام بھلا دیئے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر شاہی یعنی لشکرگاہ اور کیمپ کے ہیں اور اس کا استعمال بہت قدیم ہے یہاں تک کہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ ان معنوں میں بولا گیا ہے۔ تیموریوں اور خصوصاً شاہجہاں کے عہد میں اُردوئے معلیٰ شاہی لشکرگاہ اور دہلی کے قلعۂ معلیٰ کو کہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی۔ عام بازار گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا اس لئے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے زبان اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا۔ چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصانیف تذکرہ نکات الشعراء میں ص ۱ اور ذریعہ ص ۱۶۷ اور نوطرز مرصع مرقع رقم تحسین میں یہی نام یعنی زبان اردوئے معلیٰ کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پایا جاتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے۔

مزید معلومات کے لئے ڈاکٹر گیان چند جین کی تازہ تصنیف "اُردو کے مسائل" دیکھئے۔

اور خود زبان کا نام اُردو ہوجاتا ہے۔ تذکرہ مخزن الغرائب ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۴ء کی تالیف ہے۔ مرزا جان جاناں کے حال میں " در زبان ہندی مراد اردو است خیلے خیلے فصیح بود " باغ و بہار اور دوسری فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور پر بولا گیا ہے۔ ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اُردو" "زبان" کے نام کے طور پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے"۔
(نقوشِ سلیمانی ص ۵۷-۵۸)

مولوی عبدالحق مرحوم کا خیال ہے کہ " اردو لفظ بعد میں آیا۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں زبانِ اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد لکھتے ہیں اس کے بعد زبان اردو کہنے لگے رفتہ رفتہ زبان کا لفظ اڑ گیا اور اردو زبان کے معنوں میں آنے لگا۔ مصحفی اور انشاء کے زمانہ میں اس کا عام رواج ہو گیا تھا۔" (خطبات ص ۹۲)

موجودہ دور کے ہندی کے مشہور محقق ڈاکٹر نگیندر کو بھی میری رائے سے اتفاق ہے " بھاشا کے ارتھ میں اردو شبد کا پریوگ سب سے پہلے کب ہوا۔ یہ کہنا کٹھن ہے کنتو موٹے روپ سے اٹھارہویں صدی کے مدھیہ سے یہ شبد چل پڑا۔ اس سمے بھی اسے زیادہ تر ہندی یا ریختہ کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ہندوستانی نام سے ابھیت کیا گیا ہے۔ ۔۔۔ ۱۸۵۰ میں آتے آتے اس بھاشا کے انیہ ناموں کا پرچلن بند ہو گیا اور کیول اردو نام چلنے لگا۔" ص ۳۰ مقدمہ ہندی ساہتیہ کا اتہاس)

ہندی کے مشہور ادیب اور محقق سورگیہ پنڈت پدم سنگھ اپنی تصنیف " ہندی اردو ہندوستانی " میں اپنا خیال اس موضوع پر اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ " پرانے سبھی لیکھکوں (مصنفوں) کویوں (شعراء) نے اپنی رچناؤں سرو تر (مخصوص) ہندی یا ریختہ شبد ہی کا پریوگ (استعمال) کیا ہے۔ اردو شبد بھاشا کے ارتھ میں کب سے پرچلت ہوا۔ یہ وشے اب تک وواد شبد بنا ہوا ہے۔ اس کا ٹھیک نرنے (فیصلہ) کسی اسپشٹ آدھار (خاص ثبوت) پر ابھی نہیں ہوا ہے کچھ وچار شیل ودوانوں کا کتھن ہے کہ عام طور اردو شبد بھاشا کے

لئے اٹھارہویں صدی کے انت میں استعمال ہونا شروع ہوا۔

(ہندی اردو ہندستانی ص ۲۸۔ ۲۹)

پچھلے صفحات میں مختصر طور پر میں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ ترکی زبان کے اس لفظ "اردو" نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کتنے رنگ بدلے ہیں۔ ہندوستان میں یہ لفظ ناصرالدین محمود کے دور سے شروع ہو کر خلجی، تغلق لودھی، مغل خاندان میں بابر، ہمایوں، اکبر، شاہجہاں اور جہانگیر کے زمانے میں کہیں اس کو لشکر کے معنوں میں استعمال کیا گیا تو کہیں حرم اور فرودگاہوں کے معنوں میں اٹھارہویں صدی میں یہ لفظ اردوئے معلیٰ کے نام سے مشہور ہوا اور انیسویں صدی عیسوی میں فورٹ ولیم کالج کی سازش سے تنہا ہندوستان کی مشہور قومی زبان کا مالک بن بیٹھا۔

اُردو زبان کی ابتدا اور اُس کے اصلی معمار

یوں تو اُردو کی ابتدا کے سلسلے میں کوئی مستقل بات کہنی مشکل ہے لیکن محققین نے آج تک جو نظریات پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میر امن اُردو کی ابتدا باغ و بہار میں عہدِ اکبری سے کرتے ہیں۔

۲۔ سید انشاء اللہ خاں نے "دریائے لطافت" میں لکھا ہے کہ اردو کی ابتدا شاہجہاں کے وقت سے ہوئی۔

۳۔ محمد حسین آزاد اردو کا مخرج برج بھاشا کو بتلاتے ہیں۔

۴۔ سرسید کے نزدیک اُردو کا ہیولیٰ خلجی سلاطین کے عہد میں تیار ہو چکا تھا۔

۵۔ ناسخ اردو کی ابتدا شہاب الدین محمد غوری کی فتح دہلی اور پرتھوی راج کی شکست کے بعد کرتے ہیں اور اردو کو روزمرہ دہلی بتاتے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں سونیتی پرشاد چٹرجی کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے اردو کی ابتدا مسلمان بادشاہوں کی حکومت کے وقت سے گنگا جمنا کے دوآبے سے کرتے ہیں۔

۸۔ ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی۔

۹۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ اردو کا ہیولی وادی سندھ میں تیار ہوا تھا۔

۱۰۔ محمود شیرانی اور شیر علی سرخوش پنجابی سے اردو کی ابتدا بتاتے ہیں۔

۱۱۔ اب یہ آواز بھی اُٹھنے لگی ہے کہ اُردو گجرات میں پیدا ہوئی۔

۱۲۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری فرماتے ہیں کہ اُردو کا منبع پالی میں دیکھنا چاہیے۔

۱۳۔ ہزاری پرشاد دویدی اس کو قدیم پراکرتوں اور سنسکرت کے اتیصال سے بنا ہوا بتاتے ہیں۔

۱۴۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں کا خیال ہے کہ اُردو بانگڑو اور ہریانی کے صوتی تغیرات سے پیدا ہوئی ہے۔

۱۵۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اُردو زبان دہلی یا اس کے آس پاس کی بولی سے پیدا ہوئی۔

اُردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں جتنے نظریات اب تک پیش کئے گئے ہیں وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب کچھ یورپین محققین کی آراء بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سر چارلس لائل اردو کی ابتداء عہد اکبری سے اردو بازار سے کرتے ہیں۔

۲۔ گریسن اُردو کو ادبی ہندوستانی کی ایک شاخ بتا کر اس کی ابتداء مغل سلاطین کے شاہی فوجی بازار سے کرتے ہیں۔

۳۔ بیمس نے اُردو کی ابتداء اکبر کے عہد سے کی ہے۔

۴۔ جرمن مؤرخ ڈاکٹر ونٹر نے اس کی ابتدا گیارہویں صدی ہجری میں بتلائی ہے جب فارسی عربی اور برج کے علاقہ کی بھاشا کے میل جول سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔

۵۔ کول بروک اُردو کو برج بھاشا کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں اس کی ابتدا پندرھویں صدی عیسوی کے آخر سے کرتے ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدا تیمور کے حملے کے وقت سے ہوئی ہے۔

۷۔ ڈاکٹر گراہم بیلی اپنی مشہور کتاب اردو لٹریچر میں محمود شیرانی کی پیروی کرتے ہوئے اردو کی ابتدار پنجاب سے کرتے ہیں۔

غرض کہ اردو کی ابتدار کے متعلق مورخین نے عجیب عجیب موشگافیاں فرمائی ہیں اپنے اپنے خیال کے مطابق جدا جدا نظریات پیش کئے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے تجار جنوبی ہند دکن میں تجارت کی غرض سے آیا جایا کرتے تھے۔ ۷۰۶ء میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں بہت سے عرب تاجر ساحل مالابار پر بس گئے تھے ان کی زبان عربی تھی اس کے اور مقامی زبان کے امتزاج سے ایک نئی زبان تیار ہوئی اور یہی اردو کی ابتدار تھی۔ اُردو کی ابتدار کے متعلق یہ نظریہ قیاس ہی کی حد تک محدود ہے کیونکہ اردو ایک آریائی زبان ہے اور دراویدی اور تامل، تلگو وغیرہ زبانیں تورانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے عربی اور دراویدی زبانوں کے امتزاج سے اردو کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

عربوں کے ہاتھ فتح ایران سے کچھ لوگ بھاگ کر گجرات میں آ بسے۔ دوسرے گجرات سے ایرانیوں کا پرانا تعلق بھی ہے اس کی بنا پر کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلوی اور مقامی زبانوں کے اتصال سے اردو گجرات میں پیدا ہوئی لیکن یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ گجراتی خود اس زمانہ میں ارتقائی دور میں تھی اور پارسی بھی اتنی زیادہ تعداد میں وہاں نہیں آئے تھے کہ پورے ملک کی زبان کو متاثر کرتے ہاں کچھ الفاظ ان کی وجہ سے فارسی کے گجراتی بولی میں ضرور ضم ہوگئے اور گجراتی کو دیسی گجراتی اور پارسی گجراتی میں تقسیم کر دیا۔

سب سے پہلا حملہ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر کیا اور سندھ نویں عیسوی تک عربوں کے قبضہ میں رہا۔ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے ایک دوسرے کی زبان پر جو اثر پڑا اور جس کے نتیجہ میں جو [illegible] بنی اس کو اردو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آج بھی وہ زبان ہمارے سامنے سندھی کے روپ میں نظر آ رہی ہے جو دوآبہ کی زبانوں سے مختلف ہے۔ اس لئے اردو کی ابتداء کو سندھی کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔

سندھ کے بعد غزنیوں کے قبضہ میں ۱۰۰۱ء سے ۱۱۹۳ء تک پنجاب مسلمانوں کا وطن رہا۔ ۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے دہلی فتح کی تو پنجاب بھی دہلی کا ایک صوبہ بن گیا اس تاریخی واقعہ کی وجہ سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے شیر علی سرخوش[1] نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو پنجاب سے نکلی۔ شیرانی نے اس نظریہ کو مستحکم کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کی کہ پنجابی اور قدیم اردو دکنی میں صرفی اور نحوی اعتبار سے بہت مماثلت ہے لیکن مولانا عبدالحق کا کہنا ہے کہ پنجابی اور اردوئے قدیم چونکہ دونوں شورسینی سے متاثر ہیں اس لئے دونوں میں کچھ الفاظ مشترک ہونا قدرتی بات ہے۔ ظاہر ہے اس مطابقت سے اندرونی مطابقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوآبہ ہمیشہ سے اور ہر زمانہ میں اپنی زرخیزی کی بنا پر حکومتوں کے نئے سیاسی اقتدار کا مرکز رہا ہے چنانچہ ترائن اور پانی پت کی مشہور لڑائیاں اسی میدان میں ہوئیں اور اسی مقام سے علوم ہنر کی کرنیں پھوٹ کر ہندوستان کے دور دراز تاریک گوشوں میں اجالا کرتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوآبے کی زبانیں اپنے آس پاس کے علاقوں کی زبانوں پر ہمیشہ اثر انداز رہی ہیں۔ اب اس بات کے ثبوت

میں

---

[1] محترم غفار شکیل کے ایک مضمون جو علی گڑھ میگزین ۷۳-۱۹۷۴ء کے صفحہ ۸۵ پر درج ہے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ نظریہ مولانا شیرانی سے پیشتر شیر علی سرخوش بھی تذکرہ اعجاز سخن میں پیش کر چکے تھے۔

مل چکے ہیں کہ مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل قدیم اردو اپنی طفلی کی حدوں سے نکل کر جوانی کی جانب گامزن ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں نے تخلیق کی ہے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

بقول مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اُردو کے بارے میں سب سے بڑی برکت اور نعمت وہ انکشافات ہیں جو اس عینک کے ذریعہ سے ہیں
خود اپنی زبان کے اندر نظر آئے ہیں ہماری زبان سچ پوچھئے تو ایشیا کی اس سرا پا عظمت قوم کے تفریق و اتصال کی زندہ تاریخ ہے جس کی شاخیں نکلیں پھیلیں۔ چھوٹی ملیں ہٹیں بڑھیں لڑیں ٹکرائیں اور پھر ایک ہو گئیں۔ مضمون ہندؤں کا تعلق اردو سے ماخوذ از اردو سے ہندوؤں کا تعلق ملا از ڈاکٹر اجمل اجملی

اگر ہم ہندوستان کے قدیم تمدن اور تاریخ اور زبانوں کا غور سے جائزہ لیں تو ہمیں اس بات کے ثبوت مل جاتے ہیں کہ اردو کی ابتداء ہندوستانی ابتدائے تہذیب اور یہاں آنے والی اقوام کی تہذیبی قدروں، زبانوں اور مختلف مذہبی تحریکوں جنھیں برہمنوں، مذہبی مبلغوں، سادھوؤں، سنتوں اور صوفیوں نے چلایا کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

یوں تو ہندوستان میں اتنی قومیں آئیں کہ جنکا شمار کرنا ناممکن نہیں لیکن چار قومیں اپنے ساتھ ایسی تہذیب لائیں جن کے اثرات سے آج تک ملک کا گوشہ گوشہ متاثر ہے۔ یہ ہیں ڈراوڑ آریہ مسلمان اور انگریز اور ان کے آنے کے پیشتر ہندوستان میں منڈا اشراک اور نیگرو آئیڈ قبائل آباد تھے۔ ڈراوڑ اقوام جنھیں مورخ قدامانی نسل سے بتاتے ہیں نے عہد قدیم میں ہندوستان پر حملے کر کے یہاں کی قدیم قبائلی اقوام کو زیر کیا اور اپنی تہذیب کو رائج کیا۔ ڈراوڑ تہذیب ایک ترقی یافتہ تہذیب تھی جس کے ثبوت آج بھی موہن جو داڑو، ہڑپہ، نیل گری کے کھنڈرات میں ملتے ہیں جس کا کلچر اپنا کلچر تھا جس کی تہذیب اپنی تہذیب تھی۔ جو ایک رسم الخط بھی رکھتی تھی جسے براہمی رسم الخط کہتے ہیں۔ ہندوستان

آنے کے بعد آریوں نے اوستائی رسم الخط کو چھوڑ کر جو دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ اس رسم الخط کو اپنایا لیکن اوستائی زبان سے متاثر ہوکر اپنا رسم الخط رہا۔ ڈراوری زبانوں اور قدیم باشندوں کی زبانوں کے اثرات سے قدیم پراکرتیں پیدا ہوئیں جب آریہ ہندوستان آئے تو یہاں ڈراوری زبانوں کے علاوہ یہ پراکرتیں پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔ ان دیسی اور ہند آریائی زبانوں کے ملاپ ہی قدیم اردو کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ پھر جب مسلمان ملک میں آئے تو ایرانی زبان فارسی یہاں کی زبانوں سے ملی تو یہ نئی زبان پیدا ہوئی

دوسری زبردست قوم جو ہندوستان میں آئی وہ آریہ تھی جس کے کلچر کا اتنا زبردست اثر تھا کہ جس نے بہت سی اقوام اور تہذیبوں کو اپنے اندر سمو لیا یا ان پر اتنا زبردست اثر ڈالا کہ وہ مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر ان کے رنگ میں رنگی ہوئی معلوم ہونے لگیں وہ آریوں کے اصلی وطن کے بارے میں ابھی ایک رائے پر مورخ جمع ہو سکے ہیں اور نہ ماہر لسانیات ہی یہ طے کر سکے ہیں کہ یہ لوگ کہاں سے آئے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ ہندوستان آنے سے پہلے آریہ ایران آئے اور پھر ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ مشرقی ایران افغانستان وغیرہ میں رہے) ایران کا نام ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ایران آریوں کا ملک ہے۔ ہندوستان کا نام بھی انھوں نے آریہ ورت تھا ایرانی آریاؤں کی مذہبی کتاب کا نام اوستا ہے اور ان کی زبان کا نام بھی اوستا تھا یہ ایک کتاب بھی ہے اور اس زبان کی دنیا میں واحد کتاب ہے۔ آریوں کی مذہبی کتاب کا نام وید ہے اور ان میں سب سے پرانا رگ وید ہے جس کے ابتدائی اشلوک قندھار میں لکھے گئے اور باقی سندھ میں۔ ایران لفظ ایر کی جمع ہے۔ یہ لفظ آریہ سے مشتق ہے جس کا مطلب سنسکرت اوستا میں پاک نژاد ہے۔ پارسیوں کی کتاب اوستا میں لکھا ہے کہ آریہ لوگوں کے دو ایسے قبیلوں نے ان دونوں ملکوں کو آباد کیا جو ایک ہی قسم کی تہذیب اور تمدن کے حامل تھے۔ ڈاکٹر زور کا کہنا ہے کہ ان دونوں کی زبان ایک تھی اور آریہ گروہ ہندوستان میں اوستی قدیم سنسکرت قدیم جرمن یا لاطینی زبان بولتے ہوئے بھارت میں آئے۔ میکڈونل ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر کی تحریر کے مطابق انیسویں صدی

میں آریوں اور انکی زبان کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی یورپ سے لے کر ہندوستان تک جو زبانیں بولی جاتی ہیں یا پہلے کبھی بولی جاتی تھیں ان میں کئی زبانیں مثلاً لاطینی جرمن قدیم فارسی سنسکرت وغیرہ ایک اصل سے ہیں اس بنیادی زبان کا نام ہند یورپی یا ہند جرمانی رکھا گیا ہے۔ آریہ جب ہندوستان آئے تو یہی زبان بولتے ہوں گے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقدمہ تاریخ اردو میں آریوں اور ایرانیوں کی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق م مقرر[1] کی جا سکتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریہ اپنے داخلہ ہندوستان سے قبل عرصے تک مشرقی ایران میں قیام کرتے ہیں جہاں انکی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ ق م تک "ہند ایرانی" منزل پر پہنچ

ڈاکٹر احتشام حسین کا اس بارے میں خیال ہے

[1] جس طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں بتائی جا سکتی کہ ہند یورپی والے زمین کے کس خطہ سے تعلق رکھتے تھے اسی طرح یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم کہ آریہ قوم کہاں اور کب اس بڑے ہند یورپی گروہ سے علیحدہ ہوئی اور کن راستوں سے ہوتی ہوئی دنیا کے مختلف حصوں سے چلے۔ عراق ہوتے ہوئے ایران اور ہندوستان پہنچے ایران میں کتنے دن رہے انکی زبان میں جغرافیائی اثر سے کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے۔ یہ یقینی طور پر نہیں معلوم لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ مختلف ٹکڑوں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور انھیں میں کے بعض گروہ تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ہندوستان آتے رہے۔ آریوں کی مختلف لہریں اپنے لسانی ورثہ اور لسانی تغیرات لے کے آئیں لیکن چونکہ وہ لوگ ایران میں رہ چکے تھے اس لئے ایرانی آریوں اور ہندوستانی آریوں کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ دونوں نے ایک سا بھجن گائے ایک طرح کے دیوتاؤں کی پرستش کی اور تقریباً ایک ہی طرح کی سماجی زندگی بسر کی یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی آریوں کے قدیم بھجن اور گیت جو رگ وید میں پائے جاتے ہیں۔ ایرانیوں کی قدیم ترین مناجاتوں سے مماثلت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جاتی ہے۔ ہند یورپی زبان کی یہ "ہند ایرانی" شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جاسکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلی اور جسے بولتے ہوئے آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آریوں کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک نہیں تھا۔ یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا۔ (ص ۲۱) مقدمہ تاریخ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں

اس بات کی تصدیق کہ اوستائی اور قدیم سنسکرت دو سگی بہنیں ہیں، پارسیوں کی کتاب اوستا اور رگ وید کے قدیم اشلوکوں کو دیکھ کر اور ان کا تجزیہ کرنے سے ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد مجیب "زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ژند اوستا اور رگ وید کی زبان میں اتنا کم فرق ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان آنے اور رگ وید کے مرتب ہونے کے درمیان لمبا عرصہ نہ گزرا ہوگا۔

(تمدن ہند ص ۷۴)

قدیم سنسکرت اور اوستا کی زبان میں اتنی مماثلت پائی جاتی ہے کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان سنسکرت کی سگی بہن ہے۔ الفاظ اور قواعد کے لحاظ سے اوستائی اور سنسکرت میں اس قدر مشابہت ہے کہ سنسکرت کا ایک عالم اوستا کے متن کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ ایران میں دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک اوستائی اور دوسری ہخامنشی۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اوستائی دائیں سے بائیں اور ہخامنشی سنسکرت کی طرح بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی ہیں۔ ہخامنشی سلطنت کے دور میں سندھ ایرانی حکومت کا جزو تھا اور ہندوستانی سپاہی ایرانی لشکر میں شامل تھے۔ اس میل جول کا نتیجہ اشوک کی لاٹ کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایرانی شہنشاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رکھتے ہیں جو اوستا میں پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت صرف معنوی نہیں ہے بلکہ صوتی اور لسانی حیثیت سے بھی دونوں میں گہرا تعلق ملتا ہے لیکن میکڈونلڈ نے لکھا ہے کہ دونوں کی عبارتیں بہت معمولی صوتی تغیرات کی مدد سے ایک دوسرے میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔
ص ۳ مقدمہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از ڈاکٹر سید احتشام حسین

نے دورِ قدیم سے ہندوستان اور ایران میں قریبی تعلق رہا ہے۔ امبیکا پرشاد واجپائی
اپنی تصنیف "ہندی پر فارسی کے پربھاؤ" میں لکھتے ہیں کہ " ہندوستانی معلم
بھی فارس جایا کرتے تھے۔ شاہ گشتاسپ کے عہدِ حکومت میں ویاس رشی فارس
پہنچے تھے۔ شاہ نے زردشت سے ویاس جی کی ملاقات کرائی تھی اگرچہ ایرانی
لوگ ہندوستان پر حکومت نہیں کرتے تھے مگر فارسی زبان و تہذیب ہندوستان
پر صدیوں سے حکومت کرتی چلی آرہی ہے[۱]

مہابھارت میں دریودھن کے جس محل کی سجاوٹ کا تذکرہ کیا گیا ہے اسے مورخ
ایرانیوں کی آرائش جیسا بتلاتے ہیں۔ پھر پاٹلی پتر پٹنہ میں چندر گپت موریہ کے
محل کے کھنڈرات کے بارے میں ڈاکٹر سپونر کا خیال ہے کہ اس کا نقشہ وہی ہے
جو نقشِ رستم میں دارا کے بنوائے محل کے کھنڈرات کا ہے۔ ایران اور آریہ
ورت کے نام ہی اس ملک کے باہمی رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں جس طرح ہندوستانی
آریوں کی زبان سنسکرت نے پورے ہندوستان کی قدیم زبانوں کو اور
اس کے ساتھ ساتھ اپنے پڑوسی ممالک لنکا، ماترا، جاوا، بورنیو، ملایا، برما
کمبوڈیا کی زبانوں سیام انڈوچائنا کو متاثر کیا ہے۔ اسی طرح اوستا سے بنی ہوئی فارسی
نے وسطِ ایشیا، عرب اور مغربی ہندوستان کی زبانوں پر اثرات ڈالے۔ اوستا
اور سنسکرت کی مماثلت دیکھ کر ہی مشہور محقق پوپ نے فرمایا کہ اوستا کا
مطالعہ لسانیات سنسکرت کی ایک شاخ ہے اور خود اوستا کے معنی ہیں علم
کی کتاب اور وید کے معنی بھی وہی ہیں۔ وید سنسکرت زبان کی ود (विद)
دھاتو سے بنا ہے جس کے معنی ہیں جاننا۔ اسطرح ایرانی مصدر (دھاتو)
وت (वित) بمعنی جاننا سے اوستا لفظ ہے۔ اس طرح وید اور اوستا
کی اصل ایک ہی ہے۔ سنسکرت کی مانند اوستا کی آٹھ حالتوں والی زبان ہے
۔تذکیر و تانیث میں بھی یہ سنسکرت کی مقلد ہے لیکن (مفرد) "ودین" (تثنیہ)
اور بشیں (جمع) کے ساتھ ساتھ باہمی بہت کی اور توضیح کے لئے چند

[۱] جس طرح انگریزی تہذیب انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان پر حکمراں ہے۔

الفاظ پیش ہیں۔

سنسکرت	اوستا	معنی
کشتر	خشتر	سلطنت
یجنا	لینا	قربانی
جانو	زانو	زانو
شون	سپن	کتا
ہشتا	زست	ہاتھ
شتم	ستم	سر
مترا	متھرا	سورج

ان کی یہ مشابہت ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں ایک گھر کی بیٹی ہیں اور ان کی ماں وہ قدیم زبان تھی جس کی شاخیں سنسکرت اوستا، یونانی "لاطینی" اور قدیم جرمن زبانیں ہیں۔ وہ زبان جو ایران میں رہ گئی تھی اس زبان نے سامی، بابلی اور آسوری عناصر سے متاثر ہو کر ایک اعلیٰ زبان ترتیب دی جو ایک اعلیٰ تمدن کی بانی ہوئی اور جس نے اپنے قرب وجوار حتیٰ کہ وسط ایشیا کی زبانوں کو بے حد متاثر کیا بلکہ وہ وسط ایشیا کی دوسری زبان بن گئی تھی۔

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم اس بارے اس طرح رقم طراز ہیں اور اردو کو فارسی اور سنسکرت دو سگی بہنوں کی آمیزش کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

"اس علم الالسنہ کے طفیل میں فی الحال یہ ایک طے شدہ تاریخی مسئلہ ہے کہ قدیم الایام میں تمدن انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ میں آریہ کے نام سے مشہور ہے وسط ایشیا،

کے ایک مردم خیز خطے میں پھیلا پھولا اور جب اس کی ایک ابتدائی قلم اس سے کاٹ کے ارض مغرب اور یونان و روم کی سواد میں نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیلا اور اس کی ایک زبردست شاخ بڑھ کے ہندوستان پر سایہ افگن ہوئی اور دوسری مغرب میں پھیل کے ممالک عجم کی بہار بن گئی ان دونوں شاخوں نے یہاں تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصل، تنا فنا ہو کے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گیا اور دونوں ممتاز و سرسبز شاخوں نے ہندوستان و ایران کی زمینوں میں اپنے لئے نئے درخت پیدا کر لئے اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے ان کو ایک دوسرے سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا اور دونوں میں جدا جدا خصائص و تشخصات پیدا ہو گئے۔ آریہ قوم کی ان دو شاخوں کے ایک ہونے اور اس کے بعد پھر ملنے کی سچی تاریخ ہماری اردو زبان ہے مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا در اصل ہزار ہا سال کی مفارقت کے بعد ان دونوں شاخوں کا ہم آغوش ہونا تھا۔" مضمون "ہندوؤں کا تعلق اردو سے" ماخوذ از اردو سے ہندوؤں کا تعلق ص۹ ڈاکٹر اعجاز الحق

آریہ تھوڑے تھوڑے گروہ در گروہ ہندوستان میں آئے تھے جیسا کہ میں پچھلے صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ پہلے وہ سندھ اور پنجاب میں بسے اور پھر دوآبے یعنی مدھیہ پردیش میں پھیلے اور آہستہ آہستہ بنگال تک پھیل گئے اسی طرح انکی ویدک سنسکرت بھی مقامی ڈراوڑ زبانوں سے متاثر ہونے لگی۔ ڈاکٹر چٹرجی نے ایسے بہت سے الفاظ کی طویل فہرست دی ہے جو ڈراوڑ زبانوں کے سنسکرت زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ان ہی اثرات سے ویدک سنسکرت میں تغیرات ہونے لگے اور جدید سنسکرت کی ترتیب دی گئی۔ پانینی نے اس کی قواعد ترتیب دی اور اس کو ایک ادبی زبان بنا دیا۔ کیونکہ سنسکرت ایک فاتح اور ایک

زبردست کلچر رکھنے والی قوم کی زبان تھی اس لئے یہ ملک کے ہر گوشے میں پہنچ گئی اور ملک کی ہر زبان حتیٰ کہ دراوڑی زبانوں تک کو متاثر کیا اور ان میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہو گئی۔ یہ زبان صدیوں تک اعلیٰ طبقوں مذہبی فرقوں اور حکومتوں کی جو پشاور سے لے کر بنگال تک اور ہمالیہ کی ترائی سے لے کر راجیشورم تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کی سرکاری زبان بن گئی۔ لیکن محققین کا کہنا ہے کہ یہ عوام کی زبان کبھی نہیں رہی یہ اس طرح اعلیٰ طبقوں اور حکومتوں کی زبان رہی جس طرح مسلم دور میں فارسی اور انگلش دور میں انگریزی سرکاری اور اعلیٰ طبقہ کی زبانیں رہیں، سنسکرت کے طفیل ہندوستان کی غیر آریہ اقوام بھی برہمن کلچر اور مذہب میں رنگ گئیں اور پورے ملک میں ایک واحد تہذیب پھیل گئی جس تہذیب میں ہن شاک یونانی منگول اور سینکڑوں اقوام ضم ہو گئیں لیکن عوامی زبانیں پراکتیں برابر ترقی کرتی گئیں کیونکہ عوام اور خواص دو طبقوں میں تقسیم تھے۔ اس لئے جب سنسکرت خواص کی زبان تھی تو پراکرتیں عوام کی زبانیں رہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ عہد قدیم سے ہمیشہ ایک آدھ پراکرت پورے ملک کی رابطہ کی زبان رہی ہے۔ پہلے پالی نے یہ کام کیا پھر اردھ ماگدھی نے پھر شورسینی اور برج بھاشا نے اور بعد میں کھڑی بولی اردو نے جگہ جگہ ان پراکرتوں کے صوتیاتی لہجوں میں فرق ضرور رہا۔ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دراصل زبان کا جو نقشہ آج سے آٹھ سو برس پہلے تھا اور وہی آج سے اٹھارہ سو برس پہلے (پراکرتوں کا طلوع) بھی تھا۔ یعنی صوبائی اور مقامی بولیوں کی کثرت کے درمیان ایک ادبی زبان کی وحدت، یہ لسانی نقشہ سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ بدلتا رہا آریوں کے داخلہ ہندوستان (۱۵۰۰ ق م) سے لے کر مسلمانوں مسلمانوں کے داخلہ ۸۰۰ ء تک کی تاریخ مختلف سلطنتوں

کے بننے اور بگڑنے کے طویل داستان ہے۔ جس علاقہ کے لوگ حکومت میں کامیاب ہو جاتے اس علاقہ کی زبان آنا فانا شاہی سرپرستی میں ہندوستان کی معیاری زبان کی حیثیت سے پھیل جاتی تھی۔ اشوک کا عہد اور ماگدھی پراکرت کے عروج کا زمانہ تھا۔ جس نے مغربی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو متاثر کیا۔ ہرش وردھن اور راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعہ دوآبہ کی زبان پھر سر اٹھاتی ہے۔ پہلے شورسینی اپ بھرنش اور بعد کو برج بھاشا کی شکل میں سارے ہندوستان کی مانی ہوئی ادبی اور عوامی زبان بن جاتی ہے۔ آج بھی دوآبے کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی ہندوستان کی لنگوا فرانکا بنی ہوئی ہے جبکہ یقیناً اس تاریخی حادثہ کے طفیل ہے جو مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۵۲-۵۳)

ایک بات اور واضح کر دوں کہ جب تک ہندوستانی حکومتوں کی سرکاری زبان سنسکرت رہی پورے ہندوستان کی حکومتیں سنسکرت کی سرپرستی کرتی تھیں۔ اس وقت بھی پورے ہندوستان میں عوامی رابطے کی زبان سرکاری زبان سے الگ ایک آریائی پراکرت یا اپ بھرنش رہی۔ خواص جب سنسکرت میں تخلیقات کیا کرتے تھے تو ں۔ سادھو، سنت، مبلغوں اور بیوپاریوں

لہ بدھ مت کے زمانے میں فارسی لفظ دیپی ہندوستانی بھاشاؤں میں مستعمل تھے اس کی تفصیل یہ ہے کہ بلوچستان کے شمال میں ایک سنگین کتبہ کھرودشٹی زبان میں ہے جس میں بدھوں کے دھار... وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کتبے میں ماگدھی الفاظ کے علاوہ فارسی لفظ شاہ یعنی بادشاہت حکومت بھی کھدا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعثت سے پہلے فارسی الفاظ ہندوستانی پراکرتوں میں آ ملے تھے (۲۱) کیفیہ۔

اور موسیقاروں نے ان میں شاعری کیں اور تبلیغ کی اور گیت گائے جب مسلمانوں کے زمانے میں سرکاری زبان فارسی بنی تو تمام ہندوستان کی حکومتیں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب نے فارسی کو سرکاری طور پر اپنایا۔ پورے ہندوستان میں عوامی رابطے کی سرکاری زبان تو اُردو ہوئے قدیم بنی۔ تاریخی طور پر تین یا چار بار پورا ہندوستان ایک مرکز کے تحت رہا ہے۔ پہلے اشوک کے زمانہ میں، پھر علاءالدین خلجی اور تغلق کے زمانے میں اور اس کے بعد اورنگ زیب اور سب سے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں مرکزیت قائم رہی ہے۔ کسی بھی بڑی حکومت کے لئے عوام سے رابطے کے لئے پورے ملک کے طول و عرض میں ایک ایسی رابطہ کی زبان کی ضرورت پڑتی ہے جس کے ذریعہ حکومت کے عمال عوام سے رابطہ قائم کریں۔ اشوک کے زمانہ میں یہ کام اردو ماگدھی نے کیا۔ اگر یہ پورے ملک میں نہ سمجھی جاتی تو اشوک اس کو عوام میں بدھ مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ نہ بناتا۔ ملک کے طول و عرض میں اس زبان میں کتبے جو ملتے ہیں وہ بھی نکھدوا۱۔ اشوک کے ایک ہزار سال بعد اس ملک پر مسلمان قبضہ کر لیتے ہیں جو کہ ایک کلچر کی حامل قوم تھی۔ ادھر بدھ مذہب کا زوال اور سادھو سنت، مبلغوں اور مدارس و پاٹھشالاؤں کی بدولت ملک میں فارسی و سنسکرت اور دیسی پراکرتوں کے میل جول سے ایک ایسی زبان وجود میں آتی ہے جو پورے ملک میں سمجھی جانے لگی۔ اس زبان کو بنانے میں انتظامیہ کے اہلکار اور برہمنوں کا بھی ہاتھ تھا جو آریوں کے دور حکومت سے اس وقت تک حکومت کے انتظامیہ فوج اور عدلیہ کو چلاتے چلے آئے تھے کیونکہ جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے عدلیہ کو چھوڑ کر سب نظام جوں کا توں ہی قائم رکھا اور یہ دفاتر ہندو برہمنوں اور کائستھوں کے ہاتھوں میں رہے مسلمانوں نے اس زبان کو سیکھنا ضروری سمجھا جو اس وقت پورے ملک میں

۱ میری اس اس بات کی تصدیق فرماتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم اپنا ایک زبانی ایک تحریر

سمجھی جاتی تھی اور رابطے کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ یہی انگریزوں نے برسراقتدار آکر کیا اور قریب ۸۰ سال تک فارسی کو سرکاری زبان قائم رکھا اور جب انگریزی داں طبقہ ملک میں پیدا ہو گیا تب انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا۔ لیکن عوامی رابطہ کی زبان اردوئے معلیٰ ہی رہی جس کو ہندو مسلمانوں نے مل کر بنایا تھا بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ ہندوؤں نے بنایا تھا۔ آج جب کہ ملک کو آزاد ہوئے کافی عرصہ ہو گیا اور سنسکرت ہندی سرکاری زبان ہے تو بھی عوام کی رابطے کی زبان یہی عوامی اردوئے معلیٰ ہے۔

میں اوپر کی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ عہد قدیم سے کوئی نہ کوئی آریائی زبان ہندوستان کے طول و عرض کے لئے رابطہ کی زبان رہی ہے اور وہ پراکرتیں اردوئے قدیم کے محل کی بنیادیں رکھنے میں مصروف رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ حکیم شمس اللہ قادری کو عہد قدیم کی پالی پراکرت میں ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو آج کی اردو کے قریب تر معلوم ہوتے ہیں اور پھر اس قول کو سچا ثابت کرنے کا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں کہ قدیم پراکرتیں اردوئے قدیم کی بنیادیں رکھنے میں مصروف تھیں۔ جیسے گوتم بودھ نے کاشی و گیاجی کے بنگلوں میں اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر ایک جگہ جمع کیا تھا۔ "دھرم کرو دھرم کرو اور دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کا ڈنکا بجاؤ" ان انمول اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مضمون "ہندوؤں کا تعلق اردو سے" میں فرماتے ہیں "اردو سے اگرچہ ہندو مسلمان دونوں کا قریبی تعلق ہے اور دونوں اس کے پیدا کرنے والے ہیں مگر ہندوؤں کا تعلق زیادہ مضبوط اور گہرا ہوا ہے۔ "خسرو کے بعد ہندوؤں نے فارسی پڑھ کر سلطنت کے دفاتر فارسی میں ملازمت شروع کی اور اسی کے مقابل بعض سلطنتوں نے اپنے دفتروں کو خاص ہندوستان کی وطنی زبان میں رکھا اور مسلمان ملازمت کے لئے یہاں کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے"

صفحہ ۱۸، ۲۲ اردو سے ہندوؤں کا تعلق از ڈاکٹر اجمل اجملی

چھوٹے فقروں پر غور فرمائیے اور انصاف کیجیے کہ ڈھائی ہزار برس کی یہ زبان موجودہ اردو زبان سے کتنی قریب ہے اور کون ہے جو ان فقروں کو نہیں سمجھتا۔

میرا یہ کہنا کہ ایک زبان جسے ہم اردوئے قدیم کہہ سکتے ہیں اس کی بنیاد کافی قدیم ہے اور عہد قدیم سے وہ مختلف اقوام کے درمیان رابطے کی زبان رہی ہے اس کے لئے کسی مقام کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بنیاد کس مقام پر پڑی اور یہ کونسی زبان سے بنی۔ یہ مختلف زبانوں اور قوموں کے استعمال سے بنی اور دہلی مسلمانوں کی حکومت کا مرکز بن جانے کی وجہ سے اس میں نکھار اور ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ "دوراجی" جس نے برج بھاشا کی گرامر لکھی ہے اس میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو ویسے کے ویسے ہی آج بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ پھر چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں اردو کے ابتدائی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ ان بدھ سادھوؤں، چوراسی سدھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں کے یہاں بھی ملتا ہے جنھوں نے اپنی ملی جلی زبان میں اپنے عقیدوں کی تبلیغ کی۔ ۷۳۳ء کی چوراسی سدھوں کی زبان کا نمونہ دیکھیے۔

جہی من پون نہ سنچرئی روی سس ناہیں پولیس
تہی بٹ چت بسا کرو سرہے کہی ادیس
گھورا ندہارے چند منی جہی اجور کوئی
پرم ماسودا کھوں کے دری آ آشش پرئی

مذکورۂ بالا اقتباس میں نہ، ناہیں، کرہی آ۔ اندھارے، اجوا، دری آ قابل غور ہیں۔ کہا وغیرہ افعال کا خاتمہ (آ) پہ ہے۔ اس اپ بھرنش میں اردوئے قدیم کی جھلک ملتی ہے۔ اس طرح پدا دیا۔ سدھ ۳۳۰ھ کے یہاں بھی دیکھیا بھیا مار یا ماضی کی وہی علامتیں ملتی ہیں جو دوسرے سدھوں کے یہاں ملتی ہیں۔ گھورکھ ناتھ کی مذہبی کتب کا ایک دوہا دیکھیے۔

سوامی تم ہی گرو گوسا ئیں | ابجے تے سکھ سبد ایک بوجھیا
نسرا را انبھے جیلا کرن ددھی رہے | ست گرو ہوئی ساپوچھیا کہیے

اب دھو رھیا ہائے ہائے روپ راکھ کی چھایا
تجھا کام کر دودھ ما ہ سنسار کی مایا

بدھ سادھوں اور ناتھ پنتھی جوگیوں کے جو نمونے دیئے گئے ہیں ان کی زبان کو پرکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ اپ بھرنش سے ملی ہوئی قدیم اردو ہے۔ ۹۲۳ میں "پولیس" نام کا ایک جین مصنف ہوا ہے وہ "شیرا وکاچا ڈ" کا مصنف ہے۔ اس کے دوہوں کی زبان کا جائزہ لیجیے تو یہی لسانی میلانات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کے الفاظ قابلِ ذکر ہیں۔ جو، جن جا ستیو (کہا) سو کتو، کری، باؤلی، باورے (بار) لیکن اس عہد کی سب سے اہم تصنیف ہیم چندر ۱۰۸۸ء تا ۱۱۷۲ء کی قواعد "ہیم چندر شبدانو شاسن" ہے۔ ہیم چندر گجرات کے مشہور جین عالم تھے۔ انھوں نے اپنی قواعد میں سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ اپ بھرنش کے نمونے اس زمانے کے مقبول عام دوہوں کی شکل میں نقل کئے ہیں مثلاً ایک راجپوت عورت اپنی سہیلیوں سے کہتی ہے۔

بھلا ہوا جو ماریا بہنی مہارا کنت
لجے تم تو دا مبا ہو جبے بھگا گھر دانت

یہ دوہا اردو قدیم سے کتنا قریب ہے۔ مسلمان جب دہلی فتح کرتے ہیں تو اردو بازاروں گلیوں اور محلّوں میں بولی جاتی تھی جس کا ثبوت پرتھوی راج کی بہن پرتھا بائی کا خط ہے جو اس نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا۔

"سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان کے سنگ رشی کیش بھی بیکھنڈ کو پدھارے۔ رشی کیش جی ان چار لوگوں میں

سے ہیں جو دلی سے میرے سنگ دہنیر میں آئے تھے اس لئے ان سنخوں (کہنہ) والوں کی کھاتری (خاطرداری) راکھنا نے (طور) باچھے مارا چھیاری گراں (چاکری کرنیں چاکر) منشان (آدمیوں) کی کھاتری راکھوائی (دیو) مارا جیو کا چاکر ہے جو تھا سو (تم سے) کدی (کبھی) حرام کھوری (حرام خوری) نیوے گا (نہیں کریگا)" ـــ (کیفیہ ص ۱۹)

یہ خط موجودہ اردو سے کتنا قریب ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی بنیاد بہت پرانی ہے۔

۷۰۰ تا ۱۱۵۰ میں ہمیں اٹھارہ شاعر ملتے ہیں۔ ان میں اکرم، فیض، ہنربتی چند بردائی، جگنگ، کیدار، مدھوکر، سری دھر اور شاعرہ مکتا بائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک بات یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس دور میں رزمیہ شاعری بھی ملتی ہے اشوک کے بعد شمالی ہندوستان میں گپت خاندان اور ہرش وردھن کی حکومتیں کچھ دن قائم رہیں۔ ایک ہزار برس سے زیادہ کے عرصہ میں ہندوستان مختلف چھوٹی چھوٹی راجپوت حکومتوں میں تقسیم رہا جو آپس میں جنگ و جدل میں مصروف رہتی تھیں۔ ان لڑائیوں میں جوش دلانے کے لئے بھاٹ ہوتے تھے جو ان راجپوت خاندانوں کی تعریف اور رزمیہ شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جو رزمیہ تصنیفات ملتی ہیں جن میں قدیم اردو کی ابتدائی شکلیں ملتی ہیں۔ ان تصنیفات میں (۱) کھومان راسو (۲) وسیل راسو (۳) پرتھی راج راسو (۴) جے چندر پرکاش (۵) جے منیک جین چندریکا۔ (۶) پرمال راسو آلہا کی اصل شکل (۷) ودیا پتی پداوی۔ اس طرح کافی ہندو شعراء مسلمانوں کے آنے سے قبل ہمیں ملتے ہیں۔ جو قدیم اردو میں شاعری کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں مہاراشٹر میں بھی کئی شعراء پائے جاتے ہیں نامدیو کی شاعری میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کی کافی جھلک ملتی ہے۔

بدھ مذہب کے زوال اور راجپوتوں کے عروج کے ساتھ دیسی زبانوں کا ارتقا تیزی کے ساتھ ہوا۔ ملک میں مناور کا جال سا پھیل گیا تھا جن میں پجاری اور دیو داسیاں شمالی ہندوستان سے جاتی تھیں۔ گجرات کے مول راج سولنکی نے ایک ہزار پجاری اپنے شوہروں کے لئے دوآبہ سے بلوائے تھے۔ یہ پجاری بھجن اور کیرتن کے ذریعہ قدیم برج بھاشا کو دکن اور گجرات میں پھیلا رہے تھے۔ دوسرے نالندہ کی درس گاہ میں ہزاروں طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ بختیار خلجی کی بنگال فتح نے اسے برباد کر دیا۔ یہ لوگ پورے ملک میں پھیل گئے اور جگہ جگہ انہوں نے گرد کل اور پاٹ شالائیں قائم کر لیں۔ یہ لوگ سنسکرت اور اپ بھرنش دونوں کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح شورسینی اپ بھرنش اور برج بھاشا پورے ملک میں پھیل جاتی ہے اور گورکھ پنتھی سادھو اسے دکن میں پہنچاتے ہیں۔ یہ زبان اپنے اندر مختلف دقات میں علاقہ کے ماحول کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب دہلی فتح کر کے پورے ہندوستان میں پھیلے تو انھیں بھی قدیم اردو اس طرح سیکھنی پڑتی ہے جیسے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے قدم جمنے پر ہندوستانی سیکھنا ضروری سمجھا اور اس کے لئے فورٹ ولیم کالج کھولا۔ لیکن یہ مسلمان یہاں آکر یہیں کے ہو گئے تھے۔ اس لئے انھیں یہ زبان سیکھنا مشکل نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ جہاں کہیں مسلمان سپاہی، امیر، یا سردار اور عام لوگ پہنچے وہاں انھیں رابطے کے لئے یہ زبان ملی اور انھوں نے اسکو سیکھ لیا اور اس میں تصانیف کیں۔ کہیں اسے گجری، کہیں ہندی، ہندوی کہیں زبان ہندوستان کہا۔

مسلمان ہندوستان کے ہر گوشہ میں پہنچے اور اس کو اپنا وطن بنایا۔ یہاں کی سماج میں اپنا مقام بنایا اور یہاں کی بولی کو اپنی بولی قرار دیا۔ اور اس میں تصانیف بھی کیں۔ سلیمان سعد کو قدیم اردو کا پہلا مسلمان شاعر بتایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس سے پہلے کے شعراء کا بھی پتہ چلتا ہے۔ امیر خسرو، سلیمان سعد کی شاعری کو

ہندوی کا شاعر بتاتے ہیں کچھ لوگ سلمان سعد کی شاعری کو پنجابی یا اس زبان کی شاعری بتاتے ہیں جس کا ذکر البیرونی نے اپنی کتاب الہند میں کیا ہے۔ جو لوگ سلمان سعد کی شاعری کو پنجابی یا بازاری زبان کی شاعری بتاتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ امیر خسرو نے اپنی مثنوی سپہر میں بارہ ہندوستانی زبانوں کا نام لیا ہے جو اس وقت ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ اگر سلیمان سعد کسی اور ہندوستانی زبان کے شاعر ہوتے تو امیر خسرو اسے اُسی ہندوستانی زبان کا شاعر کہتے۔ ہندوی کا شاعر کہنے جس میں وہ خود شاعری کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے سلیمان سعد کا دیوان پڑھا تھا اور اسی زبان میں جس زبان میں خسرو نے اپنی ہندوی شاعری کی۔ ہم سلیمان سعد اور ان شعرا کو جنھوں نے امیر خسرو سے پہلے اس زبان میں شاعری کی۔ اردو کے قدیم کا شاعر مان سکتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں سے دہلی فتح کرنے سے بیشتر یہ زبان اتنی منجھ چکی تھی کہ اس میں شاعری بخوبی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بہار میں شیخ شرف الدین منیری، شیخ حمید ناگوری اور خسرو کے کچھ عرصے بعد اس میں شاعری کرتے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر سنتی پرشاد چٹرجی نے "انڈو ایرین اینڈ ہندی" میں لکھا ہے کہ "اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل نہ کی ہوتیں تب بھی جدید آریائی زبانیں پیدا ہوتیں۔ لیکن انھیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہوتی اس میں ضرور دیر لگتی۔"

(لسانیات اور اردو ص ۶۲ از ڈاکٹر سید محمود الحسن)

اس بات کو ہزاری پرشاد دویدی "ہندی ساہتیہ کی بھومکا" صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں۔ "میں ایسا کہہ کر اسلام مہتہ کو بھول نہیں رہا ہوں لیکن زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام بھارت میں نہیں آیا ہوتا تو بھی اس ساہتیہ کا بارہ آنہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ آج ہے۔"

ان اقتباسات اور پچھلے صفحات میں دی ہوئی تفاصیل سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو کی تخلیق مسلمانوں نے نہیں کی بلکہ یہ آریائی دو سگی بہنوں اور دیسی پراکرتوں کے باہمی میل جول اور امتزاج کا نتیجہ ہے۔ ایک جانب اگر اس کی بنیاد سنسکرت ڈالتی ہے تو اس کی بہن فارسی دوسری طرف اس کے ارتقاء میں امداد کرتی ہے اور اس کو جلا بخشتی ہے۔ بقول محمد حسین آزاد کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو انہوں نے اردو زبان کو گھٹنوں چلتے ہوئے پایا۔ انہوں نے اس کو چلنا سکھایا۔ یہی وجہ ہے مسلمانوں کے آنے سے قبل کی قدیم اردو اور ہندی کی تصانیف میں قدیم فارسی کے علاوہ جدید فارسی کے الفاظ کافی تعداد میں شامل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے دور میں فارسی سرکاری زبان ہو جانے کی وجہ سے یہ تعداد ہندوستانی زبانوں میں اور زیادہ ہو جاتی ہے جس طرح سنسکرت کے سرکاری اور مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے دیسی زبانوں میں اس کے الفاظ کی بہتات ہو گئی تھی یا جیسے آجکل انگریزی اور ہندی کے دفتری زبان ہونے کی بناء پر ان کے الفاظ بھی زبان میں بڑھتے جا رہے ہیں۔

اگر ہم زبانوں کے ارتقاء کے بارے میں حکومت کے انتظامیہ، عدلیہ اور دوسرے دفاتر کے اہلکاروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ان پڑھے لکھے لوگوں کی وجہ سے بھی زبانیں متاثر ہوتی ہیں۔ قدیم ڈراویدوں کے انتظامیہ کے بارے میں ہم ابھی تک تاریکی میں ہیں لیکن موہنجوڈرو اور ہڑپہ کے شہروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انتظامیہ بھی ضروری ہو گا۔ آریہ لوگ ابتداء میں قبائلی حالت میں تھے بتدریج حکومتیں قائم ہوئیں اور آہستہ آہستہ ذاتیں بننا شروع ہوئیں۔ حکومت میں جن دو قوموں کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا۔ یہ تھے چھتری اور برہمن اور اصل حکمراں چھتری تھے لیکن برہمنوں نے ایسے مذہبی قوانین بنا دیئے تھے کہ بغیر انکی امداد کے راجہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ مذہبی امور کے علاوہ حکومت کے کاروبار میں بھی یہ برابر کے حصہ دار

تھے۔ پرانوں میں چھتریوں اور برہمنوں کی اس کشمکش کو ظاہر کیا گیا ہے۔ تنہا پرس رام
نے لاکھوں چھتریوں کو مارا تھا اور ان کا زور توڑا تھا۔ بہرحال مذہبی امور کے علاوہ
حکومت میں براہمن برابر کے شریک تھے۔ انتظامیہ اور عدلیہ فوجی سب محکموں میں براہمن
برابر کے شریک تھے۔ انتظامیہ اور عدلیہ فوجی سب محکموں میں براہمن حصہ لیتے تھے
کیونکہ یہی ایک تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ مہابھارت اور رامائن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ براہمن
فنون جنگ سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ پرس رام، درناچاریہ، وشوامتر، دوال
اور میگ ناتھ جیسے بہادر سب برہمن تھے۔ چندر گپت موریہ کا سپہ سالار اور وزیر
چاڑنک بھی براہمن ہی تھا اور حکومت کا راجہ کے بعد سب سے بڑا سربراہ تھا۔ اس
نے ارتھ شاستر میں ان محکموں کے دفاتر کی تفاصیل لکھی ہیں۔ تاریخی حقائق سے پتہ
چلتا ہے کہ حکومت کے ہر شعبہ میں چاہے مذہبی ہو یا انتظامی۔ براہمن چھائے ہوئے
تھے اور سنسکرت دفاتر کی زبان تھی۔ بدھ مذہب کے اقتدار کے ساتھ گو براہمنوں
کا اقتدار کم ہو گیا تھا لیکن براہمنوں کی عالمانہ حیثیت برابر برقرار رہی۔ نالندہ اور ٹکسلا مدارس
میں سنسکرت ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ اور ہندوستانی عالم چین اور ایران تک بلائے جاتے
تھے۔ کئی ہندوستانی کتابوں کا ترجمہ چینی اور ایرانی زبانوں میں ہوا۔ بدھ مذہب
کے ارتقا کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان ملک کی جنوبی حدود تک پہنچ گئی اور
جنوبی دراوڑ ریاستوں میں بھی اس کو سرکاری حیثیت حاصل ہوئی۔ گپت راجاؤں
کے دور میں جب براہمنوں کے مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ اور براہمنوں کا اقتدار[1]

---

[1] "بدھ مذہب کا اقتدار تقریباً پانچ صدی تک رہا پھر ہندو مذہب نے تعلق ذرائع سے اس مذہب
کو زیر کر کے اپنا اثر اسی طرح قائم کر لیا جیسا بدھ مذہب سے پہلے تھا۔ سنسکرت زبان کو پھر وہی مذہبی اور علمی
اہمیت حاصل ہو گئی جو گوتم بدھ سے پہلے تھی۔ چوتھی اور پانچویں صدی تک ہندو تہذیب پورے آب و تاب
کے ساتھ ہندوستان میں علم و فن کی روشنی پھیلاتی رہی۔ یہ سلسلہ کم و بیش ساتویں صدی کے نصف
اول تک قائم رہا" ص۳۶ اردو شاعری کا سماجی پس منظر از ڈاکٹر سید اعجاز حسین

دوبارہ واپس آگیا۔ دفاتر اور انتظامیہ میں پھر برہمنوں کا عمل دخل ہو گیا اور تمام دفاتر میں پھر برہمن بھر گئے۔ رام سرن شرما اپنی کتاب "تبدیلیاں ازمنہ وسطیٰ ۵۰۰ تا ۱۲۰۰ء تک میں فرماتے ہیں"۔ گیپت دور سے ریکارڈ رکھنے کا سارا کام محرّروں کے ایک ایسے طبقے کے سپرد تھا جو مختلف ناموں سے جانے جاتے تھے۔ کائستھ کرن، کرنکار، دھکرت، لیپشٹ پال، چترگیپت، لیکھک، دوبیرا، دھرا، لیکھن، کرجن، کسر چنچو۔ اکساٹیکا۔ اکساٹیالا، دھیکرتا۔ وغیرہ جس طرح ویدک دور میں ابتداء میں برہمنوں کے سولہ طبقے تھے اور براہمن ان میں صرف ایک تھا اور بعد میں سب براہمن کہلانے لگے گیپت دور میں محرروں اور ریکارڈ رکھنے والوں کے بارے میں بھی طبقوں میں ایک کائستھ کہلاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب ہی دیگر محرر کائستھ کے نام سے پکارے جانے لگے۔ (ص ۱۷)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کائستھ دفاتر میں مسلمانوں کے زمانے سے نہیں بلکہ ہندوستانی حکومتوں میں بہت قدیم زمانے سے کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ طبقہ بھی براہمن طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور بہت بعد میں کائستھ کہلانے لگا کیونکہ یہ لوگ عہد قدیم سے حاکم وقت کے ساتھ ساتھ چلنا جانتے تھے اس لئے ہر دور میں انکا اقتدار عوامی طبقوں پر رہا۔ مسلم دور میں محمد بن قاسم نے حکومت کے روینیو کا کام برہمنوں کے ہی ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اور ان پر جزیہ تک نہیں لگایا۔ یہی انتظام دہلی کے غلام خلجی تغلق لودھی اور مغلیہ سلطان کے دور میں رہا۔ بلکہ ہندوستان ان کی حکومت میں رہا دفاتر کے اہلکار براہمن اور ہندو ہی ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ان کو ہٹادیا جاتا تو نیا عملہ ٹرینڈ کرنا پڑتا۔ اور دیسی عوام سے مسلمان سردار زبان کی مغائرت کی بناء پر انکے ذریعہ زیادہ آسانی سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ ہاں عدلیہ کا سارا انتظام مسلمان قاضی و مولوی اور مفتیوں کے ہاتھوں میں رہا اور وہاں فارسی عربی چلتی تھی۔ اکبر کے زمانے میں ٹوڈرمل نے ہندو عملہ کے لئے فارسی جاننا ضروری قرار دیا۔ اور ہندوؤں نے جلد اس میں بھی ترقی کر لی پر ریونیو بدستور کائستھوں کے قبضے

اسماعیل کے ہاتھوں

میں رہا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ان لوگوں کے رشوت لینے اور عوام کو ستانے کی شکایتیں ملیں تو کچھ لوگوں کو علیحدہ کرنے کا حکم دیا لیکن بعد کو یہ مناسب نہ معلوم ہوا تو یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ مشہور مورخ خافی خان اس بارے میں لکھتا ہے۔

" بعد چنان قرار یافت کہ از جملہ پیش کاران دفتر دیوانی و بخیان سرکار ایک مسلمان پیشکار یک ہندو مقرر نمودہ باشند۔ یعنی بعد ازاں حکم ہوا کہ دفتر دیوانی میں ایک مسلمان پیشکار ہو۔ ایک ہندو۔ عالمگیر کے دور میں معمولی سپاہی اور غلام سے لے کر دیوان (وزیر) صوبہ دار (گورنر) وائی (وائسرائے) جنرل (فوجی افسر) کمانڈر (سپہ سالار) تک ہندو تھے۔ (نئی دنیا ۱۹ ستمبر ۱۹۷۷ء) عالمگیر نمبر

اصلیت یہ ہے کہ یہ حکمراں ترک تھے[1] ان کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ اس لئے انھوں نے فارسی کو ہی اپنے دربار کی سرکاری زبان قرار دیا۔ لیکن ایک تو محکمہ مال محمد بن قاسم کے زمانے سے غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھا۔ دوسرے یہ لوگ بادشاہ تھے۔ انھیں اپنی بادشاہت اور حکومت کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔ اسلام سے لگاؤ صرف اپنے مفاد کی حد تک تھا۔ اسی لئے انھوں نے کوئی شعبہ تبلیغ بھی قائم نہیں کیا۔ ان میں بیشتر اسلامی شریعت تک کا بھی تتبع نہیں کرتے تھے۔ ان کا حرم چار بیویوں تک محدود نہ تھا اور صرف دو ایک کو چھوڑ کر جیسے التمش ناصرالدین محمود اور رنگ زیب وغیرہ

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین فرماتے ہیں " سچ پوچھئے تو محمود غزنوی یا اس کے ساتھی عرب تھے بھی نہیں ترک تھے اور اس وقت دائرۂ اسلام میں آئے جب اسلامی مرکزی حکومت قریب قریب ختم ہو چکی تھی ان میں تبلیغ اسلام کا جوش تھا نہ روح نہ اسلام کی روشنی میں یہ اپنی فتوحات ہی تھا کہ اسلام کی غرض و غایت کے سانچے میں ڈھال سکتے تھے تو وہ تبلیغ و تلقین کے بجائے تلوار و فوج سے کام لینے کے عادی تھے۔ یہ لوگ عرب نہ تھے۔ ایرانی تہذیب و تمدن سے ذہنی طور پر متاثر تھے۔ ان کا معاشرہ، نظام مذہب کی بنیاد پر کم تھا۔ غیر مذہبی مصلحتوں اور دنیاوی تدابیر پر زیادہ تھا۔" (صفحہ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

کے علاوہ سب شراب کا استعمال کرتے تھے اور اسلامی شریعت کے پابند نہ تھے۔ وہ لوگ ترک سرداروں کی بہ نسبت ہندو اور نومسلموں پر زیادہ بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔ کیونکہ ان سرداروں سے انھیں ہر وقت سازش کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ محمود غزنوی تک کو اپنے غیر مسلم سالار "تلک" پر کافی بھروسہ تھا۔ علاء الدین کے وقت میں یہ عمل اور بھی بڑھ گیا تھا۔ سلطان کو اپنے نومسلم غلام ملک کافور پر سب ترک سرداروں سے زیادہ اعتماد تھا اور یہی چیز آگے جاکر خلجی سلطنت کے زوال کا سبب بھی بنی۔ خسرو خاں نو مسلم گجراتی نے بادشاہ کو مار کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ سید و لودھیوں کے زمانے میں یہ عمل برابر رہا۔ عادل شاہ کے زمانے میں ہیمو بقال کا عروج کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اکبر کے زمانے میں تو یہ عمل اور وسیع ہو گیا۔ محکمۂ مال کے علاوہ حکومت کے اور شعبوں میں بھی راجپوت راجاؤں کا ہمیشہ عمل رہا اور قریب قریب یہ دور شاہجہاں کے زمانے تک رہا۔ عالمگیر کے زمانے تک غیر مسلموں کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا۔ لیکن محکمۂ مال اس وقت بھی انکے ہاتھوں میں رہا۔

جاگیرداری سسٹم کی بناء پر چھوٹے دیہات سے لے کر شہروں تک ترک سرداروں کا غیر مسلم عوام سے چولی دامن کا ساتھ رہتا تھا اس لئے کوئی چھوٹا یا بڑا امیر ایسا نہ تھا جس کے یہاں غیر مسلم ملازم نہ ہوں یہی حال دکن میں بھی امیران صدگاہ کے یہاں تھا۔[1]

مندرجہ بالا حقائق کی بناء پر گارساد تاسی کو کہنا پڑا۔۔" واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہ ہمیشہ ہندو ملازمین کو ترجیح دیتے تھے وہ ایک ہندی سکریٹری جو ہندی

ــــــــــ

[1] تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مسلمانوں کے تسلط سے پہلے سفارتی اور ملک داری کے معاملوں میں جو مراسلے ہندو راجاؤں کے درباروں سے بلاد اسلامی کی حکومتوں کی سرکاروں میں جاتے تھے وہ فارسی زبان میں ہوتے تھے۔ ہندو درباروں کے یہ مراسلے نویس معتبر ہندو منشی ہی ہوسکتے تھے کیونکہ سفارتی اور سیاسی معاملے ظاہر ہے کہ بہت اہم اور صیغہ راز میں ہوا کرتے تھے۔ جنھیں غیر ملک کے آدمیوں پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیفیہ

نولیس کہلاتا تھا رکھتے تھے اور ان کا ایک فارسی سکریٹری بھی ہوتا تھا۔ جو فارسی نولیس کہلاتا تھا ان کے احکام دونوں زبانوں میں لکھے جاتے تھے۔

(گارسن دتاسی ولیوم ۲۱)

اس طرح کا ایک واقعہ تاریخ ہند میں اور بھی ملتا ہے۔ ایک بار اکبر سے مسلمان امرا نے شکایت کی کہ آپ اپنے اہلکار زیادہ تر ہندو کیوں رکھتے ہیں۔ اکبر نے انھیں جواب دیا کہ کل بتاؤں گا۔ دوسرے دن اکبر نے معلومات کیں تو تمام امرا کے یہاں ہندو ملازمین ہی پائے۔ سلطانی اور مغلیہ دور میں اسی طرح بادشاہ امرا، صوبہ دار، سردار، جاگیردار روسا غرضیکہ سب کے پاس ہندو ملازمین ہی ملازم تھے۔ اکبری دور میں حکومت ٹوڈرمل کے فارسی تعلیم ہندوؤں کے لئے اور بہتر ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے ضروری کر دینے کی بنا پر ہندو فارسی کی جانب اسی طرح راغب ہوئے جس طرح انگریزوں کے زمانے میں انگریزی زبان کے سرکاری زبان بننے پر بنگالی ہندوؤں نے انگریزی سیکھی۔ فارسی میں ہندوؤں کی ترقی مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہاں بوجہ طوالت فارسی داں ہندو علما اور فضلا کے نام پیش کرنے سے معذور ہوں مگر حقائق ثابت کرتے ہیں کہ اردو کو فارسی زدہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں نے زیادہ کیا۔ اردو کو فارسی زدہ کرنے کی ذمہ داری انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگاروں نے بھی ہندوؤں پر ڈالی ہے۔

This extreme persianisation of urdu was due to Hindu than to persian influence. Although urdu literature was Muslims in its origin the pro Persian element was first Hindu officers employed in Mogals administration and acquainted with persian, rather than Persian and persianised Mogals, who for many centuries used only their own language for literary purpose. Encyclopaedia of Britanica Vol II

مولانا عبدالحق صاحب بھی اردو میں فارسی الفاظ کی شمولیت کے لئے ہندوؤں کی ذمہ دار بناتے ہیں :۔ "مسلمان جب یہاں آکر بس گئے اور انھیں اپنے وطن سے کوئی تعلق نہ رہا تو فطری طور پر ان کا میل جول ملک کے اصلی باشندوں سے بڑھنا شروع ہوا۔ میل جول کا سب سے بڑا ذریعہ زبان ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھیں تو آپس میں اُنس اور اُلفت بھی نہیں ہو سکتی اور نہ دن کا روبار ہی کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی زبان میں ہندی لفظ داخل کرنے شروع کئے اور ہندوؤں نے اپنی زبان میں فارسی لفظ بولنے شروع کئے۔ اس زمانہ میں دفتر فارسی میں تھے۔ دربار کی سرکاری زبان فارسی تھی اور مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی پڑھائی جاتی تھی اور ہندو مسلمان دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ایک ہی مدرسے میں ساتھ ساتھ پڑھتے۔ اکبر کے زمانے تک سلطنت کے حساب کتاب ہندی[1] میں رکھا جاتا تھا لیکن محکمۂ احتساب کے افسرِ اعلیٰ راجہ ٹوڈرمل نے احکام جاری کئے کہ آئندہ تمام حساب کتاب فارسی میں رکھا جائے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہندوؤں کی بول چال، تحریر تقریر میں ایسی رچ بس گئی کہ انھوں نے خواستہ یا ناخواستہ فارسی کے ہزارہا الفاظ بلا تکلف اپنی زبان میں داخل کر لئے۔ یہ جو ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے ہندوستانی زبان میں بہت سے عربی فارسی الفاظ بھر دیئے ہیں یہ بالکل غلط اور بہتان ہے۔ عربی فارسی کے لفظوں کو (شعوری) داخل کرنے والے ہندو ہیں نہ کہ مسلمان۔ (خطبات ص ۱۶۲ – ۱۶۳) یہ عمل جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں پیش کر چکا ہوں کہ عہدِ قدیم سے ہوتا رہا ہے۔ اس کا باعث ہند ایرانی تعلقات ہیں۔ اور عہدِ قدیم کی پراتی پراکرتوں اور برج بھاشا کی کتب اور پتھروں پر کھدے ہوئے اقتباسات اس کے شاہد ہیں۔ انھیں حقائق کی بنا پر انصاف پسند مصنفین کو کہنا پڑتا ہے کہ اردو بنائی نہیں گئی بلکہ مختلف اقوام کے اشتراک سے وجود میں آئی اور بعد میں ہندو مسلم اشتراک نیز سے اور جلا بخشی۔ اس لئے سر تیج بہادر سپرو اور دیگر ہندو مسلمانوں کا ناقابلِ تقسیم ترکہ بتاتے ہیں اور علامہ صفی لکھنوی

[1] اس باب کے آخر میں

کے تاثرات بھی اسی بناء پر ہیں

فارسی ہندی کی آمیزش سے ہے اس کا وجود
یادگار اتحاد اہل اسلام و ہنود

علامہ صفی لکھنوی نے یہ بات اپنے شعر کے ذریعہ صاف کردی کہ دو زبانوں یعنی دو سگی بہنوں کی فارسی سنسکرت اور دو عظیم قوموں کے اتحاد سے یہ وجود میں آئی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ دیسی مسلمانوں کو بھی دہلی کے بادشاہ بیرونی مسلمانوں کے مقابلہ میں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر درباری عام مسلمان اور ہندو آپس میں زیادہ قریب ہوتے گئے اور ان میں کوئی فرق نہ رہا۔ کیوں کہ سرکاری زبان فارسی تھی اور دیسی زبان کو زیادہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا فارسی داں علماء اس کو منہ لگانا پسند نہ کرتے تھے۔ حالانکہ گھر پر وہ اُردو ہی بولتے جاتے تھے۔ اور امراء اور عالموں کے بچوں کو فارسی ترکی کے ساتھ ساتھ ہندی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن ویسے وہ ہندی کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے عوامی طبقہ کے ہندو مسلمان شعراء اور فقراء صوفی سنتوں نے عوامی زبان ہندی میں شاعری شروع کی۔ ایک تو وہ اس سے اپنا شوق بھی پورا کر سکتے تھے اور دوسرے عوام کی نظر میں وقار بھی حاصل کر سکتے تھے۔ اس زبان کو ہندو بھاشا اور مسلمان ہندی یا ہندوی کہتے تھے خسرو سے لے کر تلسی داس، میر، غالب اور سرسید کے زمانے تک اردو ہندی کے ہی نام سے پکاری گئی۔ موجودہ دور میں آخری بار ڈاکٹر اقبال نے اردو کو ہندی کہا ہے۔ "گرچہ ہندی در عذوبت شکر است" یہ بات حقیقتاً درست ہے۔ انیسویں صدی سے پیشتر ہم میں کوئی لسانیاتی اختلاف نہ تھا۔ یہ زبان ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی۔ ہندو مسلمان اسے مل کر بولتے تھے اور اس میں تخلیقات کرتے تھے اور یہی فارسی رسم الخط جسے پنڈت تلک کاشمیری نے ایجاد کیا تھا (بحوالہ سہ ماہی اردو کراچی پروفیسر شبیر علی کاظمی) ہندو مسلمانوں کا مشترکہ رسم خط بن چکا تھا۔ اس وقت اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کا کسی کو دھیان تک بھی نہ تھا اور اس سلسلے میں کوئی

اختلاف نہ تھا۔ یہ اختلاف تو انگریزوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس نے اس قومی زبان زبان کو دو ناموں میں تقسیم کر کے دو رسم خطوں میں لکھنے کی تحریک پیدا کر کے اور اسی کو دو فرقوں کے سپرد کر کے کیا۔ ہندی کے مشہور عالم اور محقق پنڈت پدم سنگھ شرما نے بڑے یاس بھرے لہجہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ہماری ہندی بھاشا ایک تھی اور ایک ہے۔ پر ہندی اردو کے نام بھید سے دو جدا جدا روپ مانے جانے لگے۔ سنسار میں اور کہیں ایسا انوکھا اداہرن (مثال) ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ جتنے آشچریہ (تعجب) کی بات ہے کہ اتنی دربھاگیہ (بدنصیبی) اور دکھ کی بھی کہ نام بھید کے کارن (ناموں میں فرق کی وجہ سے) بھاشا میں کیسا بھید پڑ گیا۔" (ہندی اردو اور ہندستانی ص ۴۱، ۴۲)

واقعی ہماری زبان ایک تھی، انگریزوں کی پھوٹ ڈالو، حکومت کرو والی پالیسی نے اس میں اختلاف ڈالا۔ اس کا ثبوت وہ مسلمان شعراء ہیں جنھوں نے خسرو سے لے کر آج تک ہندی (قدیم اردو) میں شاعری کی۔ اور وہ ہندی شعراء اور مصنفین ہیں جنھیں آج کی اردو کہلانے والی قدیم ہندی، جو ہندو مسلم اتحاد سے وجود میں آئی۔ میں شاعری اور تخلیقات پیش کیں۔ میں ان شعراء میں سے کچھ لوگوں کے نام یہاں پیش کر رہا ہوں جن کے بارے میں ہندی کے دوین چناتمک اتہاس (تنقیدی ادب کی تاریخ) کے لکھنے والے سوریہ کانت شاستری کا قول ہے۔

"اگر ہندی ساہتیہ کے گگن میں سے ہندو کویوں کو نکال دیا جائے تو سوریہ است ہو جاتا ہے اور اس میں سے مسلم کویوں کا بشکا (ختم) کر دیا جائے تو چندر ادے نہیں ہو پاتا۔"

اسی طرح بابو ہریش چند ربھارتیند ہندو قومیت کے کٹر حامی ہیں۔ لیکن وہ اردوئے قدیم کے مسلمان شعراء کے بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"ان مسلمان ہرجن پر کوٹی ہندو وارئیے یہ الفاظ ان شعرا کی سچی وطن پرستی

اور سودیشی پریم کی وجہ سے کہے گئے ہیں جنھوں نے یگانگت اور بے تعصبی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی اور اپنی پریم رس کی شاعری سے محبت کے دریا بہائے۔ تفصیل سے اس چھوٹے سے مضمون میں لکھنا بے حد مشکل ہے۔ اس لئے یہاں کچھ مخصوص شعراء کے نام لکھنے پر ہی اکتفا کروں گا۔ پہلے شاعر جس کا ذکر امیر خسرو نے اپنی مثنوی "سپہر" میں کیا ہے۔ سلمان سعد ہیں جن کا دیوان دستیاب نہیں ہوا اس لئے صرف ان کا نام ہی اردوئے قدیم کے شعرا میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ خسرو ہندی (اردوئے قدیم) کے پہلے مسلمان شاعر ہیں جو موجودہ کھڑی بولی ہندی اردو کے باوا آدم تصور کئے جاتے ہیں ان کے بعد ملّا داؤد نے "نورک" اور "چندا" نامی دو کتابیں لکھی ہیں جو آج کل دستیاب نہیں ہیں۔ کبیر کا نام ہندی اردو دنیا میں تا قیامت روشن رہے گا۔ قطبین منجھن ملک محمد جائسی، عثمان، شیخ نبی قاسم، شاہ نور محمد فاضل، شاہ آسی، خانخانان رحیم جیسے شعراء اردوئے قدیم کے روشن ستارے ہیں

اکبر، شاہ جہاں، اورنگ زیب جیسے بادشاہوں نے بھی اردوئے قدیم یا قدیم ہندی میں شاعری کی ہے۔ قادر بخش رسکھان، شیخ افضل اللہ خاں کے نام ہندی شاعری میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میرا بائی کے ساتھ ساتھ تاج بیگم جیسی مسلمان عورتوں نے بھی ہندی (اردوئے قدیم) میں شاعری کی ہے۔ مبارک جمال احمد رس لین محبوب احمد اللہ، نواز دین درویش کے ناموں سے کون ہندی داں واقف نہیں۔ ان ناموں میں میں نے دکن اور گجرات کے شعراء کو طوالت کی وجہ سے شامل نہیں کیا ہے۔ جنھوں نے اپنی گنگا جمنی شاعری سے ہندی ادب (اردوئے قدیم) میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔

یہ تمام شاعری جو قدیم اردو جسے کو ہندی کہا جاتا تھا۔ میں کی جاتی تھی اور اس کو اردو ناگری دونوں رسم خط میں لکھا جاتا تھا۔ آخر کو آہستہ آہستہ ہندو اہل علم اور

البتہ ان کے روزمرہ کے فارسی رسم خط کے بہت کم استعمال کے باعث اردو رسم خط کا رواج
زیادہ ہوتا گیا اور ہندی رسم خط قریب قریب معدوم ہوگیا۔ مرحوم مسعود حسن خاں
ادیب کے ذاتی کتب خانے میں کچھ قدیم اردو (ہندی) اور ہندو مصنفین کی کتابوں
کے مخطوطے جن کا رسم خط اردو ہے جن کی فہرست انھوں نے اپنے مضمون اردو
رسم خط کی علمی حیثیت میں دی ہے۔ میں انکی تفصیل یہاں پر درج کر رہا ہوں۔
(۱) سندر سنگار مصنف سندر کوی (۲) رسارنواز سکھ دیو کوی۔ (۳) مانگا بھید
گنگا دھر نے ۱۲۱۳ھ میں نقل کی تھی۔ (۴) سجا کا بھوکھن النکار ۱۳۱۲ھ میں نقل
کی گئی (۵) امر چندیکا بلغت مصنف امریس (۵) اسکب با مصنف کشو داس (۶)
رس راج مصنف متی رام شیو پرشاد امید علی اور طالب حق ۱۲۸۸ھ میں نقل کی ہے
(۸) انیکارتھ مصنف نند داس (۹) نام مالا ۱۲۱۵ میں نقل کی گئی (۱۰) انور چندکا
مصنف انور کوی (۱۱) بھگوت گیتا مصنف ہری بلبھ سمیت ۱۸۷۴ (۱۲) لیلاوتی ٹیکا
ودیا دھر۔ ۱۴۔ ۱۵۔ دو رسالے مانگا بھید پر۔ (۱۶) ایک منظوم کتاب مصنف
بہاری لال۔ ( ) ایک مجموعہ جس میں رحیم احمد تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

اس ہندی کے بارے میں جسے آجکل اردو کہتے ہیں جو ہندو مسلمانوں کی آٹھ سو
سال کی مشترکہ کوششوں سے بن سنور کر تیار ہوئی جس کے بارے میں اس باب میں
کافی لکھا جا چکا ہے۔ مولانا عبدالحق مرحوم کا کہنا ہے کہ اردو کی تنظیم اور تربیت میں اگر
ہندوؤں کی شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ حقیقتاً یہ ایک سچا قول ہے
اردو زبان کے ادبی میدان میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ملتا جس میں ہندو فضلا مسلمانوں
کے صرف دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اُن سے چار قدم آگے سرگرم تگ و تاز کرتے نظر آتے
ہیں۔ اردو زبان شیخ و برہمن کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس زبان نے انھیں دونوں
کی باہمی اخوت و محبت کے سایہ میں نشو و نما پائی ہے۔ زمانہ قدیم میں اگر کسی بزم میں

عرفی و نظیری سرگرم سخن نظر آتے ہیں تو ایسی بزموں کی کمی نہیں جس میں سور داس اور کبیر کے نغموں سے فضا گونجا کرتی تھی۔ اس شیرازۂ اتحاد کے زریں اور درخشاں اوراق پر جہاں امیر خسرو، میر تقی میر، سودا اور آتش وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ وہیں پر ولی رام ولی دیوانہ پروانہ، راقم وغیرہ کے اسمائے گرامی بھی منقوش ہیں۔ آج انگریز کی مکارانہ پالیسی کی بدولت اس مشترکہ زبان کا مسئلہ ایک سیاسی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ امر یقیناً قابلِ عبرت ہے کہ جن لوگوں کے دل و دماغ نے اردو کی تخلیق و تنظیم کی اور اس کی آبیاری میں جن کا خون کام آیا آج انھیں کی اولاد بر بنائے وجوہ اس کی قبر کھودنے اور ایک مضبوط تناور درخت کی جڑیں کاٹنے میں مشغول ہیں۔ اگر مکمل طور پر ہندو شعراء کا نام اور کلام پیش کیا جائے، جنھوں نے اردو میں شاعری اور اس زبان کی آبیاری میں اپنا وقت اور خون صرف کیا ہے تو یہ فہرست طویل ہو جائے گی اور بقول رفیق مارہروی ”پندرہ بیس ہزار شعراء کا ذکر کرنے کے بعد بھی کافی ہندو شعرا باقی رہ جائیں گے۔“

جس طرح ابتداء سے اردو زبان کی تخلیقات میں دلی کے ہندو برابر کے حصہ دار رہے ہیں۔ اسی طرح آج بھی اردو کے اس انحطاط کے زمانے میں بھی ہندو ادبا کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بقول ابراہیم اشک ” ہماری زبان ۔ مورخہ یکم اکتوبر تا یکم نومبر ، ، ” کہ آج اگر ہم کسی سے یہ سوال کریں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کون ہے تو جواب ملے گا راجندر سنگھ بیدی۔ سب سے بڑا شاعر تو نظریں رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پر جا کر ٹھہر جائیں گی۔ اور اگر کہا جائے کہ غالب پر کس کی اتھارٹی ہے تو ایک نام لیا جائے گا۔ جناب مالک رام۔ اقبال پر کس کی ماسٹری ہے تو پتہ چلے گا جگن ناتھ آزاد کی۔ اردو کا اس وقت سب سے بڑا مزاح نگار کون ہے تو جواب ہوگا کنہیا لال کپور اور اگر دریافت کیا جائے کہ اردو کا اس وقت سب سے بڑا ماہر لسانیات کون ہے تو ڈاکٹر گیان چند اور گوپی چند نارنگ کے نام زبان پر آئیں گے۔ تحقیق اور تنقیدی میدان میں

خیام موہن لال جگر، دیریندر پرشاد سکینہ، شانتی رنجن بھٹیاچاریہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پنڈت آنند نرائن ملا نظر آئیں گے۔ یعنی ہر میدان میں غیر مسلموں نے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں اس پر بھی ستم کہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اسے کلمہ پڑھانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔

غزل کی اولیت کا سہرا ولی دکنی کے سر رکھا جاتا ہے مگر ولی دکنی سے پہلے ولی رام ولی ایک دیوان مرتب کر کے چھوڑ گئے تھے اور چندر بھان برہمن جو ولی سے کہیں پہلے شاہجہاں کے زمانے میں تھے کی بھی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے بعد آنند رام مخلص، آفتاب رائے رسوا، کھیم داس اورنگ آبادی، گوہر لال دکھنی، شرب سنگھ دیوانہ مکند رام فدوی، راجہ نول رائے وفا تھے ان کے بعد سنتوک رائے بے نوا، گھاسی رام خوشدل، مکند سنگھ فارغ، بریلوی، اس طرح موجودہ دور تک ہندو شعراء کا سلسلہ چلا آرہا ہے، بندرابن راقم، مہاراجہ رام نرائن موزوں، پنڈت دیاشنکر نسیم، بالمکند بے صبر، ٹیکا رام تسلی، شنکر دیال فرحت، دوارکا پرشاد افق، منشی نوبت رائے نظر، منشی جوالا پرشاد برق، منشی چھنو لال دلگیر، کنور سین مضطر، منشی منی لال جوان۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی، جگت موہن لال رواں، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت برجموہن کیفی دتاتریہ، نرائن پرشاد مہر، منشی جوالا پرشاد برق، شیش چندر طالب، تلوک چند محروم، بشیشور پرشاد منور، خیام موہن لال جگر، گوپی ناتھ امن، گرسرن لال ادیب، آنند نرائن ملا، رگھوپتی سہائے فراق، پنڈت لبھو رام جوش، ملیارام وفا، پنڈت بالمکند عرش، جگن ناتھ آزاد۔ اور نثر نگاروں میں منشی منوہر لال دہلوی، نہال چند لاہوری، کندن لال، منشی بینی رام جہاں، توتا رام، رتی چرن مصر، کاشی رام، رتن ناتھ سرشار، ماسٹر رام چند، منشی پریم چند، سدرشن، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی اوپیندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، مہندر سنگھ بیدی سحر، رام لال وغیرہ، سیکڑوں

سانہ نگار اور ناول نگار گزرے ہیں۔ اگر اس طرح میں اردو کے ہندو خدمت گزاروں
کرہ کرتا رہوں تو مضمون بے حد طویل ہو جائے گا۔ مندرجہ بالا حقائق سے یہ ثابت ہو جا
کہ قومی زبان جس کو ہندو مسلمان سکھ سب قوموں نے اپنا پسینہ بہا کر سینچا تھا۔ اور
ندوستان میں قومی یکجہتی اور یگانگت کی ندیاں بہائی تھیں۔ اس سے سورگیہ تیج بہادر
رو کا یہ قول صحیح ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ میراث
ے۔ اسی بنا پر سورگیہ ڈاکٹر تارا چند کو کہنا پڑا کہ انیسویں صدی سے پہلے ہندو مسلمانوں
زبان ایک تھی اس میں کوئی افتراق نہ تھا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالحق نے خطبات
رسن دتاسی کے اقتباسات سناتے ہوئے فرمایا کہ "میں جو کسی قدر طویل اقتباسات
کر سنائے ہیں ان سے میرا منشا یہ بتانا تھا کہ اردو زبان خاص کر اٹھارہویں صدی
آخر اور انیسویں صدی کے ابتدا میں اپنی مقبولیت عالمگیری میں سبقت لے
ئی تھی۔ یہ رفتار اس کی برابر جاری ہے۔ چنانچہ موسیو دیپان نے جو فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ
رکن اور سینٹ کے ممبر اور فاضل شخص تھے اپنی کتاب "اقوام کی پیدائش قربت" میں ایک
ب ہندوستانیوں کے متعلق بھی لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری
کاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ ۔۴ لاکھ ہے۔ آپ کو معلوم رہنا چاہیے
ن میں بیس کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز مشترکہ رشتہ کا کام دیتی ہے وہ اردو
ن ہے۔ یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ کی سرزمین میں بولی جاتی ہے (خطبات
ن دتاسی ص ۲۶۵ ۔ خطبات عبدالحق ص ۱۱۷ ۔ ۱۱۶) اور اس وقت پنجاب
ست حیدرآباد اور دوسری ریاستوں میں بھی جن میں اس وقت فارسی اور اردو
ئج تھا اگر ان کے اردو بولنے والوں کی تعداد دی جائے تو یہ تعداد اور بھی
دہ ہو گی۔ اس زبان کے بارے میں لنک لن برنارٹ کی ہسٹری آف دی انگلش لنگویج
سے اقتباس پیش کرتا ہوں جو انہوں نے یو این او کے صیغہ زبان کے اعداد و

شمار سے پیش کیا ہے۔ وہ چینی زبان کے بولنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"After chinese and English the great languages of the world are in descending order of number of speakers who employ them as a primary tongue, spanish with 140 millions speakers, Russian with 130 millions, German with 100 millions, Japanise 95 millions, Arabic 80 millions, Bangali, Indoneasian and portuguese 75 millions each urdu (spoken in Pakistan and part of India) 70 millions, French and Hindi 65 millions, Italian 55 millions." Page 13 History of English language by Lincoln Barne

مندرجہ بالا اقتباس سے دنیا کی بین الاقوامی زبان میں اردو کا نمبر دسواں اور ہندی کا نمبر گیارہواں ہے۔ اردو کے بولنے والے ستر کروڑ اور ہندی کے بولنے والے پینسٹھ کروڑ بتاتے ہیں۔ ان میں کھڑی بولی یا جدید ادبی ہندی کے بولنے والے اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ایک کروڑ بھی نہیں نکلیں گے۔ ویسے اردو فلموں کو ہندی فلم اور اردو گیتوں اور گانوں کو ہندی کے گانے بتایا جاتا ہے۔ موجودہ ہندوستان کے ذہین طبقے کے طرز فکر کا ایک اندازہ راجندر پوری کے اس مضمون سے ملتا ہے۔ جو السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے۔ موصوف نے ہندوستان کے وزیر خارجہ شری اٹل بہاری باجپئی کے اس بیان پر تبصرہ کیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ میں ہندی کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تبصرہ نگار نے وزیر خارجہ کی تجویز میں ترمیم کرتے ہوئے مشورہ دیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ہندی کے بجائے ہندوستانی کا جھنڈا

اٹھایا جائے تو واقعی کامیابی ہو سکتی ہے اور پورا برصغیر یا جنوبی ایشیا اس کی تائید کرے گا۔" یہ ہے دونوں زبانوں کے ایک نام کا اثر، ناموں کی تقسیم نے انھیں بین الاقوامی طور پر دسویں اور گیارہویں نمبر پر پہنچا دیا ہے۔ جبکہ مشترکہ طور پر اس زبان کا نمبر دنیا میں چوتھا ہے۔

اس زبان کے مٹانے کے لئے انگریزوں نے کیا کیا کوششیں کیں اس کے لئے مجھے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختصر طور پر روشنی ڈالنی پڑے گی۔ جس کو اگلے باب میں مطالعہ فرمائیے گا۔

صفحہ ۶۶ کا حاشیہ

(حاشیہ صفحہ ۶۶) مشہور ہندی مصنف ٹھاکر کمل دھاری کملیش اپنی مشہور تصنیف مسلمانوں کی ہندی سیوا میں فرماتے ہیں "بھارت ورش میں مسلمانوں کا شاشن کال یدیپ ۱۱۹۳ء سے پرارمبھ (شروع) ہوتا ہے۔ یدیپ (اگرچہ) انکا سب سے پہلا آکرمن (حملہ) ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ دیش کو جیت کر اس پر اپنا ادھیکار (قبضہ) کر لیا۔ تب ہندوؤں کو لاچار ہو کر مسلمانوں کا آدھی پتر (ماتحتی) سوئی کار (منظور) کرنا پڑا اور ان سے گھنشٹھا استاپت کرنی پڑی۔ محمد بن قاسم نے منتری کو راجیہ کا کاریہ سونپ کر کاریالے (دفاتر) برہمن کرمچاریوں (اہلکاران) کو نیکت کیا تھا جس سے راجیہ کا سب کام کاج ہندی میں ہوتا تھا۔ ۱۰۱۳ء میں محمود غزنوی نے جب ہندوؤں سے پنجاب کا راجیہ لیا اس نے بھی وہاں کاریالیہ ہندی میں اور ہندوؤں کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ ۱۱۹۳ء میں جب شہاب الدین غوری نے دہلی کا سامراجیہ ہست گت (فتح) کیا تب اس نے بھی اپنا دفتر ہندی میں رکھا تھا۔ سلطان سکندر لودھی نے یدیپ دھارمک کچھ بات کا ذکر ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کے لئے بادھ کیا تھا تھاپی (اگرچہ) وہ اپنے کاریالیوں (دفاتر) کا کام ہندی چھوڑ فارسی میں نہیں کرا سکا تھا۔ سمراٹ اکبر کے شاشن کال (عہد حکومت) سے پہلے تک ہندی کی یہی دشا تھی۔ اس سے اسپشٹ جان پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے ہردے میں ہندی کے پرت بڑا آدر (قدر) تھا صد ۲۔ مغلیہ سلطنت کے دفاتر کے ہندوؤں کے قبضے میں ہونے کی تفصیلات میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔

اردو زبان اور انگلش ڈپلومیسی[1]

"کھڑی بولی ہندی کی ابتدا فورٹ ولیم کالج میں ہوئی، اس وقت وہاں کے ہندو مصنفین خاص کر للولال کب اور سدل مسر نے اردو سے عربی فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت الفاظ داخل کئے تاکہ ہندوؤں کے لئے ایک مشترکہ زبان بن سکے۔

(گریرسن لسانیاتی جائزہ ہند جلد اول حصہ اول)

ہندوستان میں انگریزی حکومت کا قیام سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان ۱۷۵۷ء پلاسی کی لڑائی اور اس میں انگریزوں کی فتح سے شروع ہوتا ہے۔ بارہویں صدی کے آخر میں اختیار الدین خلجی بنگال فتح کرتا ہے اور بنگال مسلم حکومت کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور فیروز تغلق کے زمانے میں بنگال دہلی حکومت سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ اور وہاں ایک آزاد خود مختار حکومت قائم ہوجاتی ہے اور اکبر کے دور تک قائم رہتی ہے کیونکہ دہلی کے سلطانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اس لئے بنگال میں مسلم حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ فارسی بھی آتی ہے۔ لیکن پٹھانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ لوگ فارسی کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کی ترقی کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ رامائن، مہابھارت اور کئی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے اسی دور میں بنگالی زبان میں کرائے گئے اور بنگالی میں بھی کئی نئی تخلیقات ہوئی ہیں اور ادھر مسلمان درویش

[1] اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ڈاکٹر حکم چند نیر کی تازہ تصنیف "اردو کے مسائل" ضرور ملاحظہ فرمایئے۔ (کنول ڈبائیوی)

بھی بنگالی کو ہی تبلیغ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ باہر سے روزگار کی تلاش میں آنے والے مسلمانوں اور سرکاری زبان ہونے کی بنا پر بنگالی ہندوؤں کے فارسی سیکھنے کی وجہ سے بنگالی زبان میں سیکڑوں فارسی الفاظ داخل ہو جاتے ہیں اور مسلم بنگالی[1] وجود میں آتی ہے اور کچھ کتابیں مسلم بنگالی میں عربی رسم خط میں بھی لکھی جاتی ہیں۔ فارسی زبان مغلیہ دور حکومت اور اس کے زوال پھر بنگال کے صوبہ داروں کی خود مختاری یعنی ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی دور حکومت تک فارسی سرکاری زبان تھی اور اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ بلکہ پورے بنگال میں بولی بھی جاتی تھی کیوں کہ شاہ عالم کے اور انگریزوں کے معاہدوں میں یہ شرط بھی تھی کہ فارسی کو سرکاری زبان رکھا جائے گا۔ اس لئے انگریزوں نے فارسی ہی کو سرکاری زبان قائم رکھا اور وقت

---

[1] مسلم بنگلہ اصل میں اُردو کی بنگلہ شکل ہے۔ صرف خط بدل گئے ہیں اور صوت کے اعتبار سے کچھ فرق ہے۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی اپنی تحقیقی اور مشہور کتاب "بنگلہ زبان کی ابتدا اور ارتقا" صفحہ ۲۳۶ میں بنگالی زبان پر تفصیلی بحث کی ہے مسلم بنگالی اور بادشوار کی زبان ہندو اور بادشواہ کی زبان سے کچھ مختلف تھی۔ سترہویں صدی عیسوی میں عبدالغفور صدیقی نے مسلمانی بنگلہ میں ایک مشہور مثنوی تصنیف کی تھی اعلیٰ ہندو بنگالی بھی فارسی آمیز بنگلہ بولتے لکھتے تھے بنگالی کی پہلی نثر کی کتاب جو رام رام باسو نے لکھی تھی جس کا نام راجہ پرتاپ دتیہ کا چرتر میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ قاضی نذر الاسلام کی نظمیں اور گیت بھی مسلم بنگلہ سے متاثر ہیں لیکن مسلم بنگالیوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے اس کی جڑیں گہری نہ ہو سکیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہی برہمنی پنڈتوں کو بنگلہ کی فارسی زدگی کا احساس پریشان کرنے لگا اور وہ فارسی آمیز بنگلہ سے اجنبیت محسوس کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بنگلہ سے ایسے عربی اور فارسی الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔ جن کے متبادل الفاظ سنسکرت میں موجود تھے پھر بھی کافی الفاظ بدلے ہوئے تلفظ میں اب بھی زبان میں موجود ہیں۔ تلخیص مقالہ بنگالی کا اردو ادب پروفیسر جاوید نہال

کے منتظر رہے۔ فارسی ۱۸۳۹ء تک بنگال کی سرکاری زبان رہی۔ قریباً چھ سو سال کی مسلسل تعلق سے بنگالی زبان میں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی تھی۔ اور بنگالی زبان مسلم بنگالی اور ہندو بنگالی میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مسلمان اور فارسی داں بنگالی اسے ہی استعمال کرتے تھے۔

جو لوگ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ عیسائی اور مسلمانوں میں ابتدائے اسلام سے ہی منافرت چلی آرہی ہے۔ مسلمان صدیوں تک یورپ کے ایک بڑے حصے اسپین اور پرتگال پر قابض رہ چکے ہیں۔ قریب چھ سات سو سال تک بیت المقدس (یروشلم) کے لئے صلیبی لڑائیاں لڑی جاتی رہیں ہیں اور ان میں کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں ان لڑائیوں کا لامتناہی سلسلہ جب جاکر ختم ہوا جب عیسائیوں کو یہ علم اچھی طرح سے ہو گیا کہ اجتماعی قوت کے ساتھ طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کی معمولی کا ئی کو بھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ ان لڑائیوں میں انگلینڈ کے رچرڈ شیر دل کا جو حصہ رہا ہے اس کو تاریخ کے اوراق سے یہ بخوبی جانا جا سکتا ہے۔ ان لڑائیوں سے انگریزوں نے یہ سبق اخذ کیا تھا کہ سیدھے مقابلہ میں مسلمانوں پر فتح پانا مشکل ہے اس لئے انہوں نے ہندوستانیوں کو آپس میں لڑا کر پھوٹ ڈالو حکومت کرو والی پالیسی کو اپنایا۔ اسی لئے وہ دوسری یوروپین اقوام کی بہ نسبت زیادہ کامیاب رہے۔ ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی لڑائی سے پہلے انھوں نے اس پالیسی پر عمل کیا۔ اپنے کٹر دشمن سراج الدولہ کے دو ہندو وزیروں کو اور اس کے بہنوئی میر جعفر کو ملا کر اس کو شکست دی اور یہی کام انہوں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف نظام مرہٹوں اور اس کے ایک وزیر میر صادق کو اپنی جانب ملا کر اپنایا اور اسے ہرایا۔ پلاسی کی لڑائی کی شکست کے بارے میں ڈاکٹر تاراچند رقم طراز ہیں۔

وہ کلائیو نے سراج الدولہ کے خزانچی درلاب رائے اور آدمی چند کو

کو سراج الدولہ کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی جس کی بنیاد پر بعد میں انگریزوں نے ہندوستان فتح کر لیا ہندو مسلم اختلافات برطانوی اقتدار شاہی کے سبب مستحکم ستون بن گئے۔ بنگال میں مسلم حکومت کے خاتمے کے تقریباً سو برس بعد تک مسلمان دشمن تصور کئے جاتے رہے اور اسی لئے برطانوی حکومت کے منظور نظر ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ برابر امتیاز برتا جاتا رہا اور پھر جب ہندوؤں میں بے اطمینانی کے نشانات بڑھتے ہوئے دکھائی دیئے تو رول بدل گئے۔ یعنی اب مسلمان حکومت کے مقرب بن گئے۔ ص ۲۲ (قومی یکجہتی اور سیکولرازم ڈاکٹر تاراچند

پلاسی کی فتح کے بعد انگریزوں نے بنگال کے نظم و نسق سنبھالا تو انھیں بنگال میں فارسی زدہ مسلم ماحول ملا۔ سب محکموں میں مسلم عہدہ دار ان چھائے ہوئے تھے۔ جن سے انگریزوں کو ازلی نفرت تھی لیکن انگریز اس وقت ہندو مسلم یکجہتی کے ماحول سے مجبور تھے بنگال میں قدم رکھتے ہی انھوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے سب سے بڑے دشمن مسلمان ہیں اور اس احساس کو حیدر علی ٹیپو کی جہات نے اور بھی بڑھا دیا اور وہ مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنا دشمن اول سمجھنے لگے اور انھیں مٹانے و کمزور کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ سب سے اول انھوں نے انکی زبان اور کلچر کو مٹانے کا تہیہ کر لیا۔ یہ پالیسی ۱۷۵۷ سے لے کر ۱۹۴۷ء اور جب کہ ان کو یہاں سے جانا پڑا اس وقت تک رہی۔

بنگال میں اس وقت ایڈمنسٹریشن، کلچر اور سماج پر مشرقی کلچر کی چھاپ تھی جس کو انھیں ختم کرنا تھا۔ پہلے انھوں نے ایڈمنسٹریشن سے مسلمانوں کو کم کرنا شروع کر دیا۔ ہر محکمہ میں نئے تیار شدہ ہندو بنگالی ملازم رکھے گئے بنگالی زبان کی ترقی کے لئے الگ کوشش شروع ہوئی۔ بنگالی میں سے فارسی الفاظ کو نکال کر اسے خالص سنسکرت نما بنگالی بنایا گیا یہ کام بہت جلد ہو گیا

کیونکہ بنگالی مسلمان اس وقت بہت پسماندہ اور علمی طور پر پچھڑے ہوئے تھے اور ان میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھے وہ فارسی کے دیوانے تھے۔ کلکتہ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں ہندو زیادہ آباد تھے۔ مسلمان جنوب اور شمالی علاقہ میں ڈھاکہ کے نواح میں زیادہ تھے اور دارالسلطنت سے دور تھے۔ بنگالی ہندو بیدار تھے۔ انہوں نے دسیوں پرائیویٹ اسکول قائم کر رکھے تھے جن میں بنگالی اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ اس لئے بنگالی زبان کی ترتیب تو بہت جلد ہو گئی۔ قریب بیس سال ہی میں لٹریری بنگلہ بہت حد تک فارسی عربی الفاظ سے پاک ہو گئی اور اس کی جگہ سنسکرت کے الفاظ سے پر کر دی گئی۔ یہی اسکیم اور یہی عمل انہوں نے اس کامیاب تجربہ کے بعد اس عظیم ہندوستانی زبان اردو کے لئے جو ملک کی واحد رابطہ کی زبان بن چکی تھی۔ جس میں عربی و فارسی کے الفاظ اس زبان کا جزو لاینفک بن چکے تھے اور جس کا رسم خط بھی عوامی ہو چکا تھا اور جو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی زبان بن چکی تھی۔ فارسی الفاظ کو خارج کرنے کا عمل اس اردو زبان پر بھی دہرانا شروع کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ زبان بنگالی کی بہ نسبت ایک عظیم زبان تھی صرف بنگال تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لئے کافی لمبے عرصہ اور بہت بڑی کوشش کی ضرورت تھی۔ ابھی اودھ اور دلی جیسے علاقے جہاں یہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی تھی اُن پر ابھی تک انگریزوں کا تسلط مکمل نہ تھا۔ جو اس زبان کے صدر مقام تھے۔ اس لئے اس کام کو ایک مکمل اسکیم کے تحت شروع کیا گیا۔ اس بارے میں محترم غفار شکیل سابق صدر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرماتے ہیں۔

"یہ زبان اس منصب پر پہنچ گئی تھی جب یہ فارسی زبان قائم تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ نیا منصب اسے راس نہ آیا۔ انگریز

ہندوستان میں وارد ہو چکے تھے اور اپنی شاطرانہ چالوں سے ایک ایسے انقلاب کو لانے میں کامیاب ہو رہے تھے جس نے برسوں بلکہ صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کو الٹ دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ملاپ انھیں کھلتا تھا۔ لہذا دونوں میں نفرت و تعصب کے بیج بوئے ان کی مشترکہ زبان کو فارسی رسم خط اور دیوناگری رسم خط کی الگ زبان قرار دے کر اس کی یگانگت اور وحدت کو مٹا کر اردو اور ہندی کے دو واضح اور علیحدہ نام دیئے گئے۔"

(زبان و مسائل زبان ص ۱۰۶)

اس وقت انگریزوں کو دو قسم کی پریشانی تھی۔ اول یہ کہ محکمہ مال و عدالت دیوانی و فوجداری اور دفاتر کا سارا عملہ فارسی داں تھا۔ دوسری جانب فوج اور عوام میں مختلف نسلوں کے لوگ تھے جن میں مغلوں کے وقت سے ہندوستانی رائج تھی۔ عوامی اور کاروباری سطح پر بھی ملک کے ہر حصہ میں ہندوستانی ہی کام دے رہی تھی۔ اس لئے کمپنی میں ملازمت کرنے والوں انگریزوں کو دو زبانیں سیکھنی ضروری تھیں ایک فارسی اور دوسری ہندوستانی۔ اس بات کو کمپنی کے ڈائرکٹر بخوبی سمجھتے تھے اور ان ہی انگریزوں کو ملازم رکھتے وقت ترجیح دی جاتی تھی جو فارسی اور ہندوستانی سے واقف ہوتے تھے۔ عہد اورنگ زیب میں جب انگریزوں کی حکومت صرف مدراس اور بنگال کی بندرگاہوں تک محدود تھی۔ ۲۲ دسمبر ۱۶۷۷ کو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اپنے ایک مراسلہ میں قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو لکھا تھا کہ " اس کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے۔ ان کو دس پونڈ اور جو ہندوستانی (اردو) سیکھیں گے۔ ان کو ۲۰ پونڈ انعام دیئے جائیں گے۔ نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم

دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر کیا جائے۔"

(گل کرائسٹ اور اس کا عہد ص ۷۴-۸ بہ عتیق صدیقی)

ہندوستانی کا ذکر اس خط میں اس لئے ہے کہ ہندوستانی (اردو) عہد عالمگیر میں راس کماری سے لے کر ہمالیہ کی ترائی تک سب ہی مقامات پر سمجھی اور بولی جاتی تھی اس بارے میں جان فریر کا یہ اقتباس جو انھوں نے اورنگ زیب کے زمانے میں تحریر کیا تھا۔ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ "دربار کی زبان فارسی ہے اور عوام انڈوستانی زبان بولتے ہیں۔" (گل کرائسٹ اور اس کا عہد ص ۷۴)

اورنگ زیب کے زمانے میں اردو ایک ترقی پسند زبان کی شکل میں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھی بولی جانے لگی تھی اور اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہی پورے ہندوستان کی رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ اس کی اہمیت کا ثبوت سر چارلس مٹکاف ریزیڈینٹ دلی کا وہ خط ہے جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کو لکھا تھا۔ یہ خط ۹ ۲ راگست ۱۸۰۶ کا ہے اس خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔ "ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں میں ملازمت کے سلسلے میں رہا یعنی کلکتہ سے لاہور کے قریب وجوار تک کوہستان سے نربدا تک افغانوں، راجپوتوں جاٹوں، سکھوں اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں جن میں میں نے سفر کیا ہے۔ میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی اگر کیپ کامرون یا راس کماری سے کشمیر تک اور برہمپترا سے دریائے سندھ کے دھانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندوستانی بول سکتے ہیں۔ ہندوستانی ہی وہ زبان ہے جو عام طور پر کار آمد ہے۔ میری رائے میں اسے وہ عام وسعت حاصل ہے جو دنیا میں کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔

(خطبات گارسن دتاسی ص ۱۵ ۳ خطبات عبدالحق ص ۱۱۶ - ۱۱۷)

کیونکہ اس زمانے میں بغیر یہاں کی زبان سیکھے ہوئے انگریز حکام کو یہاں کام چلانے میں سخت پریشانی کا سامنا ہوتا تھا اس لئے ڈائریکٹرس نے ہر انگریز کو ۲۰ روپے ماہوار کا ایک منشی الاؤنس دے کر رکھا تھا جس سے وہ ایک منشی ملازم رکھ کر فارسی اور ہندوستانی سیکھ سکتے تھے۔ پھر کئی لوگوں نے جن میں ڈاکٹر جان گل کرائسٹ بھی تھے ہندوستانی اور فارسی سکھانے کے لئے مدرسے کھول رکھے تھے۔ لارڈ ڈولزلی جو اس وقت گورنر جنرل تھے نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھوائی جہاں ہندوستانی فارسی کے علاوہ دوسری دیسی زبانوں کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور تعلیم دینے کے لئے کتب بھی تیار کی جاتی تھیں اس کالج نے جو کام کئے وہ اہل ادب سے پوشیدہ نہیں اردو اس وقت ایک اہم زبان تھی عوام میں بے حد مقبول تھی۔ بنگال میں اس کا رواج عام ہوتا جا رہا تھا فارسی تو خیر سرکاری زبان تھی ہی، شری رائے کالی پرسنا سین نے بنگالیوں کو اردو سیکھنے کی ضرورت پہ زور دیتے ہوئے اردو ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھا ہے

"اردو زبان کا علم حاصل کرنا ہمارے لئے اب پہلے سے بھی بہت زیادہ ضروری ہو گیا ہے کیونکہ یہ وہ زبان ہے جو نہ صرف ہمارے گاڑی والے کوچوان دربان، دکاندار، فقیر، جہتر وغیرہ تک بولا کرتے ہیں" جن سے ہمیں روزانہ بات جیت کرنے اور تبادلۂ خیالات کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ یہ ہمارے ملک کے جنوبی اور مغربی علاقوں کے لینے والوں کی زبان بھی ہے اور آمد رفت کی سہولیتوں جیسا کہ ریل ہو جانے سے ہوا ہے اور جو سہولتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں انکی وجہ سے ان تعلقات کو بڑھانے کے لئے اردو زبان کو جاننا آج انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔"

(بنگالی ہندوؤں کی ادبی خدمات از شانتی رنجن بھٹہ چاریہ)

اردو نے یہ ترقی غیر محسوس طور پر کی تھی۔ زبان کا ارتقا کسی کا رہین منت نہ تھا حکمراں طبقہ اردو اور فارسی دونوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ صوبوں میں صوبائی زبانوں اور پورے ملک میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنانا چاہتا تھا لیکن موقع اور وقت کے انتظار میں تھا اور وہ انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں اس کے صوبائی دیسی زبانوں کو ابھارا، مسلم بنگالی سے فارسی الفاظ نکال کر اسے پیور سنسکرت نما بنا دیا گیا تھا۔ فارسی کی جگہ کچھ دن کے لئے مصلحتاً یا مجبوراً اردو کو صوبہ بنگال کی سرکاری زبان بنایا گیا اور سات آٹھ سال بعد ہی بہار کے کچھ اضلاع کو چھوڑ کر (اس زمانے میں بہار بھی احاطہ بنگال میں شامل تھا) بنگالی کو صوبہ کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ اسی دن سے بنگال میں اردو جاننے والوں کو بہاری کہا جاتا ہے اور ان بہاری (اردو جاننے والوں پر بنگلہ دیش کی زمین تنگ ہے) یہ انگریزوں کی سب سے پہلی منافرانہ کوشش تھی۔ حالانکہ اس کی بنیاد سری رام پور کے مشنریوں نے ڈالی تھی جنھوں نے ۱۲ زبانوں کے ٹائپ تیار کرا کر اسکولوں اور عیسائی مذہب کی توسیع کے لئے کتابیں چھپوا کر صوبائی اور لسانی تعصب کو ہوا دی تھی۔ اسی منافرانہ کوشش نے آگے جا کر ہندی ہندو ہندوستانی اور ہندوستانی صوبہ پرستی کو ہوا دی۔

انگریز فارسی کی سرکاری زبان کی حیثیت ختم کرنا چاہتا تھا مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ فارسی کی جگہ پورے ہندوستان کے رابطے کی زبان ہندوستانی بنے وہ حقیقتاً اس کے خلاف تھا۔ اردو یا کسی ایسی دیسی زبان جس میں مسلم کلچر کی تھوڑی سی بھی چھاپ ہو۔ ترقی کرے یا واسطہ کی زبان بنے۔ اس لئے اردو کو فارسی الفاظ سے صاف کرنے والی اسکیم انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ اردو سے ہی ایک نئی زبان پیدا کر کے اس کا اپنا نام رکھ کر اپنائی۔ اس زمانے میں ہندوستانی جیسا کہ میں اوپر کی سطور میں تحریر کر چکا ہوں، مکمل طور پر ادبی حلقوں میں فارسی رسم خط

میں لکھی جاتی تھی اور ناگری رسم خط اردو کے لئے رائج نہ تھا ہاں برج بھاشا ناگری رسم خط میں ضرور کہیں کہیں لکھی جاتی تھی۔

ولیم کارمیل اسمتھ نے ہندوستانی اور انگریزی لغت ۱۸۲۰ء کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔

"چونکہ ناگری رسم خط ہندوستانی (اردو) زبان کے لئے بہت ہی کم استعمال کیا جاتا ہے اور ہندوستانی عالم اسے استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے میں نے ناگری رسم الخط قطعاً استعمال نہیں کیا ہے۔"

مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ ناگری رسم خط کو کیوں ابھارا گیا۔ یہ بھی صحیح ہے کئی صدی پیشتر کچھ ہندو اہل علم اکثر برج بھاشا کے لئے اسے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں اس کا بھی رواج بہت کم ہو چکا تھا جس کی مثال جناب خلد آشیانی مسعود حسن ادیب کے کتب خانے کی سنسکرت آمیز قدیم اردو کے مخطوطوں کی لسٹ میں پچھلے صفحات میں پیش کر چکا ہوں۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کہ مسلمان قدیم اردو / سنسکرت نما ہندی میں شاعری کرتے آئے تھے۔ میں کچھ ہندو مسلم شعراء کی لسٹ بھی پیش کر چکا ہوں بلکہ موجودہ ہندی محققین کا کہنا ہے کہ ہندی کے ہندو کویوں جیسے چندر بردائی، تلسی داس، سور داس، بہاری وغیرہ نے فارسی الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال کئے ہیں لیکن مسلمان کویوں (شعراء) جیسے رحیم، عثمان قطبین، رسکھان، رس لین وغیرہ نے اپنے کلام میں بہت کم فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس سے ہماری زبان پر اس طرح کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جیسے اس دور میں بھی بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام نے موجودہ بنگالی روش کے خلاف بہت سے فارسی و عربی الفاظ اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں اور گجراتی بھی ہندو گجراتی اور مسلم گجراتی میں تقسیم ہو چکی تھی۔ آج بھی دونوں فرقوں کی

کی تخلیقات میں یہ فرق نمایاں ہے اور پھر پنجابی زبان میں زبان کے فرق کے ساتھ ساتھ رسم خط کا فرق بھی پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں پنجابی گورمکھی رسم خط میں اور پاکستان میں اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان زبانوں میں زبردست طور پر کوئی افتراق نہیں پایا جاتا۔ ہر پنجابی اور ہر گجراتی ہر بنگالی ہر سندھی (کیوں کہ اب کچھ لوگ سندھی کو بھی ناگری رسم خط میں لکھنے لگے ہیں) ہر ملیالم بولنے والا چاہے وہ عربی و فارسی آمیز زبان ہو یا سنسکرت نما، چاہے وہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہو ملیالم رسم خط میں، وہ اس زبان کو پیار کرتا ہے اور اس کو اپنی مادری زبان سمجھتا ہے۔ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ اردو زبان جو ایک مشترکہ زبان تھی اسے دو حصوں میں تقسیم کیوں کیا گیا اور اس میں سے بھی ایک نئی زبان کی تجدید کیوں کی گئی

ؒ ہندی کے آدھونک گرنتھ نامی کتاب میں جناب کرشن آچاریہ نے اس موضوع پر یوں روشنی ڈالی ہے "ہندی مینول ۱۸۰۲ء میں چھپا، سنگھاسن بتیسی اور دھونی ہندی کی پہلی طبع شدہ کتاب مانی جاسکتی ہے۔

اجنک شری برجیندر ناتھ وندو پادھیا کرت اور وشال بھارت جنوری ۱۹۴۲ء میں تحریر کے مطابق ڈبلیو جی بیلی کرت "ہندوستانی" اصلیت میں ناگری لیپی اور اردو بھاشا میں لکھا مضمون) کے عنوان کے تحت لکھی تھیسس کو ہندی کی اولین طبع شدہ کتاب مانا جاتا رہا ہے مخصوص تحقیق کی روشنی میں شری وندھیا پادھیئے کی تحقیق کو ہی اولیت دینی پڑے گی۔ دوسرے الفاظ میں ہندی کی اولین طباعت کی تاریخ ۱۸۰۲ء ہی ٹھہرتی ہے۔ اس سال ہندی کی تین کتابوں کا تعلق پریس سے جڑا۔ ۱۸۰۳ء ہندوستانی پریس سے کمل پریم ساگر چھپا جتر بھیج مشرکی یہ برج بھاشا نٹک دللو لال کوی کیرت کھڑی بولی روپانتر آگے کے ۲۰،۲۵ سالوں تک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

. اس کو جدا نام کیوں دیا گیا۔ اور اس کو فرقہ وارانہ منافرت کی جڑ کیوں بنایا گیا۔ جیسا کہ فورٹ ولیم کالج کی سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔ اگر مندرجہ بالا صوبائی زبانوں کے بھی اردو ہندی کی طرح دو نام رکھ دئیے جاتے اور انہیں بھی دو فرقوں کے سپرد کر دیا جاتا تو ان صوبائی زبانوں میں بھی فرقہ وارانہ عصبیت پیدا ہو جاتی۔ فورٹ ولیم کالج کی اس منافرت آمیز پالیسی کے سلسلے میں ہندی اردو کے کئی مشہور ماہر لسانیات میرے ان الفاظ کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی رائے کو کس طرح غلط قرار دیا جا سکتا ہے۔ انگریز کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک کالج قائم کیا جا سکتا مقصد یہ تھا کہ انگریز عہدہ داروں کو ہندوستانی زبان سکھائیں اور ساتھ ہی عیسائی مذہب کے متعلق اس زبان میں معلومات فراہم کریں۔ چنانچہ کئی کتابیں لکھوائی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خاص تخلیق مانی گئی پریم ساگر ۱۸۱۰ء کے بعد کئی پریسوں نے چھاپا۔ اس کے انگریزی ترجمے چھپے سخت الفاظ کی لغت بھی چھپی للولال جی نے پہلی بار کھڑی بولی الفاظ کو طباعت کی شکل اسی ۱۸۱۰ء کے طباعت کے ذریعہ دی۔ انگریزوں نے اس کتاب کو خاص اہمیت دی اور کہا کہ جدید ہندی کی نثر کی پیدائش فورٹ ولیم کالج میں ہوئی۔ حکمراں طبقہ کی یہ خصلت ہے بنگالی نثر کا موجد بھی ولیم کری کو مانا جاتا ہے۔ ملا صلا ۲۳ ہندی کے آدمدک گزشتہ

(حاشیہ صفحہ ہذا)

فورٹ ولیم کالج میں للولال جی کب اور سدل مصر سے جان گلکرسٹ نے ناگری لپی میں جو کتابیں لکھوائیں للولال جی نے پریم ساگر لکھی جس کے بارے میں گریسن نے اپنے لسانیاتی جائزہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

گئیں اور ان کی وجہ سے اردو نثر کی ذخیرے میں بہت اچھا اضافہ ہوا۔ لیکن افسوس

حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں لکھا ہے۔

"Practically written in Urdu with Indo Aryan words substituted where ever a writer in that form of speech would use Persians.

یہ کتاب دراصل اردو میں لکھی گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جہاں کوئی دوسرا مصنف فارسی الفاظ استعمال کرتا وہاں ہند آریائی الفاظ رکھدیئے گئے تھے۔ اس کتاب اور اس کے فوراً بعد فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر لکھی جانے والی ہندی کتابوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ کھڑی بولی کی عبارت سے فارسی عربی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں داخل ہو گئے ہیں نکال کر سنسکرت کے الفاظ کے ساتھ ایک نئی زبان کو رائج کیا جائے جو بقول جان گریرسن ہندوؤں کی قومی زبان بن سکے۔ رام چندر شکل نے لکھا ہے۔

"اگر وہ (للو لال جی) اردو نہ جانتے ہوتے تو عربی فارسی کے الفاظ نکالنے میں اتنے کامیاب کامیاب نہ ہوتے جتنے کہ ہوئے بہت سے عربی فارسی کے الفاظ بول چال کی زبان میں اتنے مل گئے تھے انھیں صرف سنسکرت جاننے والوں کے لئے پہچاننا بھی مشکل تھا مجھے ایک پنڈت جی ایسے ہیں جو لال لفظ کو برابر بولتے تھے مگر کلیجہ اور بجگی کو ملچھ زبان کے الفاظ سمجھتے تھے۔"

راجہ شو پرشاد بھی للو لال جی اور سدل مصر کی زبان جیسے رام چندر شکل ناگری الفاظ میں لکھی ہوئی اردو بتاتے ہیں کا تتبع کرنا چاہتے تھے انھوں نے اپنی کتاب التماس تمرنا خک حصہ دوم کی تمہید میں لکھا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہے کہ ہندوستانی کی ہمہ گیری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ اس کالج میں وہ خیال
ہندوستانیوں کے دماغوں میں بیج کی طرح بو گیا جو آہستہ آہستہ ایک خوفناک
تناور درخت کی شکل حاصل کر کے تمام فضا میں سمی اور جلک ہوا پھیلانے لگا۔ اس
کالج کے قیام سے قبل اردو زبان کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا شاید ہی کسی کو خیال گزرا ہو
لیکن فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد نے اپنے منشیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس
عام مشترکہ زبان کو اپنی قدیم ادبی زبانوں سنسکرت اور برج بھاشا کے رسم الخط
میں لکھیں کیونکہ فارسی رسم الخط ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لئے بدیسی ہے جس طرح

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"میں یہاں ان لوگوں سے کچھ الفاظ کہنے کی معذرت چاہتا ہوں جو ایسے خاص
الفاظ کو بھی زبان سے خارج کر دینا چاہتے ہیں جو ہماری روزمرہ کی بول چال میں
شامل ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ پر سنسکرت کی غیر مندوں انمول بے جوڑ
اور کرخت تراکیب استعمال کرتے ہیں جو صرف جاہل اور گنواروں کے لئے
قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں بڑی حد تک بیتال پچیسی
(للو لال جی کی فورٹ ولیم لکھی کتاب) کی زبان اختیار کی ہے۔"

راجہ صاحب کی اس دور کی تصانیف کا نمونہ یہ ہے ہم لوگوں کو جہاں تک
بن پڑے چننے میں ان الفاظ کو لینا چاہیئے کہ جو عام فہم اور خاص پسند ہوں
آنا رستہ جل کو زیادہ آدمی سمجھ سکتے ہیں اور جو یہاں کے پڑھے لکھے عالم فاضل پنڈت
دو د ان کی زبان میں چھوڑے نہیں گئے ہیں۔

صفحہ ۱۶۶ صفحہ ۱۶۷ صفحہ ۱۶۵ صفحہ ۱۶۷

ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن

ہندو اور مسلمان صدیوں کے میل اور یکجائی کے بعد جداگانہ طرزِ معاشرت اور ذہنیت رکھتے ہیں ضروری ہے کہ ان کا رسم الخط بھی انکی ضروریات اور رجحانات کے مطابق ہو (ہندوستانی لسانیات ص ۱۳۴) بعض لوگ گلا کر انگسٹ اور فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے لیکن اس کی سم آمیز اور نفرت انگیز سازشوں کے بارے میں کبھی سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے فورٹ ولیم کالج کے بارے میں سید سلیمان ندوی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:

"انگریزوں نے دہلی کے اردوئے معلیٰ کو اجاڑ کر فورٹ ولیم کالج اپنایا اور اپنا اردوئے معلیٰ کھڑا کیا تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خون کی آبیاری سے سینچ کر تیموریوں کو باغبانی سے تیار ہوا تھا پہلے کلہاڑی مارنا ضروری تھی اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کی حسین قدروں کو ممکن ہو تو ابھارا جائے۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے ایک مسلمان کے سر تھوپا گیا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا گیا اس کا نام اعلیٰ قدردانی اور ادب نوازی رکھا اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کی جداجدا کی صورت میں ہمارے سامنے قائم ہے۔ (نقش سلیمانی ص ۶۱) پھر موجودہ دور کے مشہور ہندی ماہر لسانیات ڈاکٹر گینندر بھی فورٹ ولیم کالج اور زبان کے بارے میں انگلش ڈپلومیسی پر میرے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

" ہندی اُردو میں کوئی خاص انتر نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی بھاشا
کی دو شیلیاں ہیں اس لئے آرمبھ (ابتداء) میں ہندی کا پریوگ
ہندی اور اردو دونوں کے لئے ہوتا تھا۔ انیسویں صدی
کے پرتھم چرن (ابتداء) میں انگریزوں کی وشیش بھاشا نیتی
کے کارن ہی ان دونوں کو الگ الگ بھاشائیں مانا جانے لگا
اردو کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو ہندی کو ہندوؤں
سے۔ یہ انگریز بیچ میں نہ پڑتے ہوتے تو آج یہ دونوں بھاشائیں
ایک ہوتیں " مقدمہ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۱۲۳

فورٹ ولیم کالج کے بارے میں ایک سکھ محقق بھی اس نتیجہ پر
پہنچے ہیں۔ " انگریزوں نے مذہب اور زبان کی آڑ میں اپنا مطلب ضرور
حل کیا۔ ہندوستانی زبان کو ناگری حروف اور اردو حروف میں لکھوایا۔ ناگری
حروف میں لکھی زبان کو ہندی اور اردو رسم الخط میں لکھی زبان کو اردو نام دیا
گیا جو بعد ازاں میں تعصب کی بنا پر ایک دوسرے سے دور ہوتی گئیں۔ ناگری
حروف میں لکھی جانے والی ہندوستانی سنسکرت تت سم الفاظ کی طرف جھک
گئی جب کہ اردو رسم الخط کی ہندوستانی عربی و فارسی الفاظ سے پُر ہو گئی۔ سب
سے آخر میں اس جدید زبان کو اردو نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہی نام اب
تک مروج ہے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اس نام کی وجہ سے ہی اسے ایک نئے
کی زبان کا نام دیا گیا حالانکہ یہ سینہ زوری ہے۔"

(تین ہندوستانی زبانیں۔ ص ۲۹ ۔ ڈاکٹر کے ایس بیدی)

ان تبصرات کے بعد اردو زبان کو مٹانے اور ہندو مسلمانوں میں منافرت
ڈالنے کی جو کوشش انگریز کمپنی کے حکام اور بعد میں برٹش گورنمنٹ کے

حکام نے شروع کیں ان کو بھی آئندہ مسطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جا چکا ہے کہ انگریزی کمپنی نے جب شاہ عالم سے دیوانی کا حکم حاصل کیا تھا اس میں ایک شرط یہ تھی کہ فارسی کو عدالتی زبان برقرار رکھا جائے گا۔ کمپنی جانے وں کہ تو کیا مانتی لیکن اس وقت ملکی اور کچھ اپنی ذاتی مجبوریاں اور اس وقت کے ماحول کا بھی تقاضا تھا کہ جس سے وہ اس وقت فارسی زبان کو باقی رکھنے پر مجبور ہوئی۔ وہ وقت کے انتظار میں تھی۔ وہ فارسی کو تو ختم کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی جگہ اردو کو بھی نہیں دینا چاہتی تھی بلکہ صوبائی زبانوں اور انگریزی کو وہ مقام دینا اس کا مقصد اولیں تھا۔ اس لئے انہوں نے موزوں وقت کے انتظار تک فارسی کو ہی عدالتی زبان برقرار رکھا۔ جناب عبداللہ یوسف علی انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں :" اگر فارسی کو ۱۸۳۹ء کے بجائے اسی زمانہ میں ترک کر دیا جاتا جب اردو ترقی کر چکی تھی اور دیگر دیسی زبانوں نے اتنی ترقی نہیں کی تھی تو اردو فارسی کی جگہ لے لیتی تو یہ آج تمام ہندوستان میں گفتگو کرنے کے لئے سبکی مشترکہ زبان ہوتی لیکن ان کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔ اس وقت فارسی سرکاری زبان تھی اور فارسی داں ہی منصف اور مجسٹریٹ بن سکتے تھے۔ مسلمان قوم کو زک پہنچانے اور ہندو مسلمانوں میں نفرت کی خلیج پیدا کرنے میں انگریزی حاکموں نے بڑی گہری اور دور رس سازش سے کام لیا۔

فارسی اس اس وقت ملک کے اعلیٰ طبقوں ہندو مسلمانوں کی زبان تھی۔ اس کی اس وقت کی اہمیت موجودہ دور کے مشہور مصنف اور ادیب شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے الفاظ میں سنیئے۔

" ۱۱ر جنوری ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے مسٹر ریڈیم کو بنگال اور

بہار کا سفر کر کے ملک کی تعلیمی حالات سے متعلق ایک رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ مسٹر ایڈم کی رپورٹ طویل ہے۔ فارسی کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ "یہ بات قابل غور ہے کہ فارسی حالانکہ ہندوؤں کے لئے ایک بالکل غیر ملکی زبان ہے پھر بھی اس زبان کی تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان پانچ اضلاع میں جہاں میں نے سفر کیا اگر ۲۰۹۶ ہندو فارسی تعلیم پاتے ہیں تو مسلمان طلبار کی تعداد صرف ۱۸۵۸ ہے۔

(بنگال میں ہندوؤں کی ادبی خدمات۔ شانتی رنجن بھٹہ چاریہ)

کیونکہ انگریزی حکومت اپنی سیاسی وجوہات اور مصلحت کی بنا پر کچھ دن تک فارسی زبان رکھنا چاہتی تھی۔ مگر ان خالی ایام سے بھی اس نے تفرقہ اور ہندو مسلمانوں میں باہمی نفرت پھیلانے کا کام لیا گیا۔ کمپنی کے تعلیمی فنڈ علیحدہ حکومت برطانیہ کے تعلیمی احکام کے مطابق کئی لاکھ روپیہ جمع تھا۔ اس کے خرچ کے لئے ۱۸۲۳ میں تعلیمی کمیٹی قائم ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو کتب شائع کرائیں ان میں تیرہ ہزار سنسکرت، پانچ ہزار چھ سو عربی، دو ہزار پانچسو فارسی کتابیں اور دو ہزار سنسکرت آمیز ہندی کی کتابیں تھیں اردو جو اس وقت کی عوامی زبان تھی اس کی ایک کتاب بھی شائع نہیں کی گئی۔ یہ تھی اردو دشمنی پالیسی کی سرزمین جس پر انگریز فورٹ ولیم کالج میں منافرت کا پودا لگانے کے بعد گامزن ہوئے، جنرل کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں کی ہے۔ ہم ان ہندی کتابوں کو اس لئے اردو یا ہندوستانی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ایک تو وہ اس وقت کے غیر مروج رسم الخط ناگری میں شائع ہوئیں اور وہ بھی ایسی زبان جو ہندی کم اور سنسکرت زیادہ ہے بلکہ ہم تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں اردو مخالف ہندوؤں کے لئے نمونہ کے طور پر پیش

کیں گئیں کہ تمہیں اس زبان کو جس کا نام ہم نے ہندی رکھا ہے مستقبل میں ایسی ہندی بنانا ہے نہیں تو ان کتب کے چھاپنے کا کوئی اور جواز نہ تھا۔ وہ سب کتابیں بیکار تھیں کیونکہ عربی فارسی سنسکرت خواص کی زبانیں تھیں عوام کی نہیں۔ فضول خرچی اس سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ صرف ایک عربی کتاب شائع کرنے پر بیس ہزار روپیہ صرف کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے سے قبل ہی سے ارباب فرنگ کی پالیسی منافرانہ تھی۔ وہ ہر صورت سے ہندو مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کی خواہاں تھے۔ اس لئے شروع سے ہی تعلیمی پالیسی میں بھی فرقہ واریت کی پالیسی کو اپنایا گیا۔ ۱۷۸۱ء میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا گیا جو طلباء اچھی طرح کامیاب ہو کر مدرسہ سے نکلتے تھے ان کو منصفی و قانونی عدالت یعنی ڈپٹی مجسٹریٹی کا عہدہ ملتا تھا اس سے پیشتر ان عہدوں کے لئے ذاتی قابلیت کی ضرورت ہوتی تھی۔ کسی ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اس کالج میں صرف مسلم طلباء کا داخلہ ہو سکتا تھا۔ ہندو طلباء داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ انگریزوں کو معلوم تھا کہ بنگالی ہندو بیدار ہیں وہ اپنی تعلیم کا خود کوئی انتظام کرلیں گے۔ اور یہ ہوا بھی۔ ہندوؤں کو جب اس کالج میں داخلہ نہیں ملا تو انہوں نے خود اپنے ذاتی کالج قائم کئے۔ جنھوں نے آگے جا کر انگریزی ہندی اور صوبائی زبانوں کی ترقی میں خاص پارٹ ادا کیا۔ محمد عبداللہ تواریخ کلکتہ میں لکھتے ہیں یہ کہ مدرسہ دکھانے کو مسلمانان کلکتہ کی استدعا پر قائم کیا گیا تھا لیکن حقیقت میں انگریزوں کو اس مدرسہ کی خود شدید ضرورت تھی اور وہ اس موقع کے خواہاں تھے کہ مسلمان کلکتہ نے درخواست ضرور کی تھی لیکن ان کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان میں ہندوؤں کو بالکل داخلہ نہ دیا جائے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے مدرسوں میں ہندو طلباء اور ہندوؤں کے مدرسوں میں مسلمان طلباء جیسا کہ آجکل ہے مل کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس مدرسہ کی اس شرط پر کہ صرف مسلمان

طلباء ہی تعلیم پا سکیں گے۔ مسلمان اپنی سادہ لوحی کی بناء پر خوش ہو گئے اور وہ انگریز کی منافرانہ سم بیز اور ہندو مسلم اتحاد میں نفرت کی تخم ریزی کی پالیسی کو نہ سمجھ سکے۔ انگریز نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ فرینڈ آف انڈیا (ماہنامہ) نے جون ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں کلکتہ مدرسہ کے سلسلے میں لکھا ۔" اس تعلیم گاہ کو مسٹر ہیٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں مسلمانوں کے لئے قائم کیا اس کے صدر محمد مجید الدین تھے۔ اس کی تعمیر پہ چالیس ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ یہاں ۱۷۔۔۔۲۰ سال کی عمر کے مسلم نوجوان تعلیم پاتے تھے اس مضمون میں زور دیا گیا تھا کہ اس مدرسہ میں ہندوؤں کو بھی داخلہ دیا جائے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔"

مسلم دور حکومت کے زوال کے بعد مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ان کو انگریزی سے نفرت تھی۔ مولوی صاحبان نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کے خلاف فتوے بھی صادر کر دیئے تھے بلکہ انگریزوں کے ساتھ میل جول رکھنے والے مسلمان مسلم سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اس چیز نے انھیں آگے جا کر بے حد نقصان پہنچایا۔ اور وہ تعلیمی میدان میں بے حد پیچھے رہ گئے۔

کلکتہ مدرسہ کے قیام سے مسلمان خوش ضرور ہوئے لیکن وہ اس بات کو فوری طور پہ محسوس نہ کر سکے کہ وہ اب ہندوؤں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کالجوں کے لئے الفنسٹن کرنل ٹاڈ وغیرہ نے متعصبانہ انداز میں تاریخیں لکھیں جن میں مسلمان بادشاہوں کو ظالم اور جابر ہندو کش حکمرانوں کی شکل میں پیش کیا گیا۔ ان باتوں سے ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج کو اور وسیع کرنا شروع کیا اور مشنری بھی مذہب پھیلانے کی آڑ میں ہندو مسلم اتحاد کے محل کو آتش زدہ کرنے میں تیل اور آگ کا کام کر رہے تھے۔ کلکتہ مدرسہ

کے قیام کے چند ہی سال بعد بنارس میں ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج قائم ہوا۔ انگریزوں نے فرقہ پرستی کو ہوا دینے کے لئے بنارس کو چنا۔ بنارس سنسکرت کالج کا قیام ہندو مسلم اتحاد کے خلاف انگریزوں کا دوسرا اہم عملی قدم تھا۔ ہندو مسلمان الگ الگ تعلیم پانے لگے اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ بنارس کالج کی بنیاد بنارس ریاست کے ریزیڈنٹ جوناتھن ڈنکن ۱۷۹۱ میں رکھی۔ اس نے اس کالج کے قیام کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"اس قسم کے ادارے کے قیام سے ہمیں دو اہم فائدے مل سکتے ہیں اولاً ہندو عوام اس سے خوش ہونگے اور ہندوؤں کے تعلیمی نظام کی جانب توجہ دینے سے دیسی راجاؤں میں اپنی حکومت کو مقبول بنانے کا رجحان پیدا کر سکتے ہیں اور اس سے انگریزوں کا نام اور انگریزی قوم کے وقار میں اضافہ ہوگا

(تاریخ ہند شارب ص ۴۲)

کیونکہ فارسی اس وقت سرکاری زبان تھی۔ کلکتہ مدرسہ میں ہندوؤں کا داخلہ نہ ملنے سے کلکتہ میں کئی اسکول ہندوؤں نے خود قائم کئے۔ اور اس طرح دوسرے مقامات پر بھی ہندوؤں نے پرائیویٹ اسکول اور کالج قائم کئے۔ میں پیشتر عرض کرچکا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنی قدامت پسندی کے باعث انگریزوں سے نفرت تھی۔ بنگالی ہندوؤں نے ہوا کے رُخ کو پہچان کر انگریزی سیکھنا شروع کردی فارسی کے سرکاری عدالتوں اور دفتروں سے ہٹنے کے بعد سرکاری عہدوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ مسلمان ہندوؤں سے کافی پیچھے ہوگئے۔ انگریزی سے مسلمانوں کی یہ نفرت کافی دن تک بنی رہی اور آخر میں سرسید نے باوجود شدید مخالفت کے انگریزی تعلیم مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھی اور اسکول اور کالج قائم کئے

لیکن انگریزی تعلیم سے یہ نفرت مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی اور تعلیمی میدان میں اپنے برادرانِ وطن سے کافی پیچھے ہوگئے۔ ہندوؤں نے ہوا کا رخ سمجھتے ہوئے ملک کے گوشہ گوشہ میں اسکول اور کالج قائم کرلئے اور جب انگریزوں نے قومی زبان میں سے ایک نئی زبان ناگری ہندی بنائی اور اس کو ہندو قوم کی قومی زبان بنا کر اس کے سپرد کردیا تو ان اسکول کالجوں نے ہندی کی ترقی اور اردو کو نقصان پہنچانے میں کامل پارٹ ادا کیا ریزیڈینٹ جوناتھن کے خیال کے مطابق سنسکرت کالج اسکیم کامیاب رہی اور جب ہندی اردو دو حصوں میں بٹ گئی تو راجہ بنارس نے ہندی کے ارتقاء میں زبردست پارٹ ادا کیا تمام ہندو ریاستوں نے ہندی کرا پنایا۔ نواب حسن خیال نے "مغل اور اردو" میں لکھا ہے۔

" جنگ بکسر ۱۷۶۴ء کے بعد شاہ عالم اور لارڈ کلائیو کے درمیان جو عہدنامہ ہوا۔ اس کی رو سے اس ملک کے علم وزبان کی نگہداشت بھی کمپنی پر فرض تھی۔ کلائیو کے بعد وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲) کا دور دورا ہوا انہوں نے ایک بہانہ نکال کر شاہ عالم کا ۲۶ لاکھ سالانہ وہ نذرانہ بند کیا جس کی ادائیگی اس عہدنامہ کی اول شرط تھی۔ اس پر ملک میں ایک ہیجان ہوا۔ اس اضطراب کو دھیما کرنے کے لئے زبان کی نگہداشت کے پیمان کو قائم رکھنے کا ڈھنگ نکالا گیا۔ جان گلکرسٹ نے اس سیاسی چال میں کمپنی کو بڑی مدد دی انہوں نے کلکتہ میں مشرقی زبانوں کی پرداخت کے لئے ایک انجمن یا سوسائٹی قائم کردی ادھر یہ انجمن دھیمے دھیمے اپنا کام کر رہی تھی اور ادھر وارن ہیسٹنگز چپکے چپکے اپنا رستہ نکال رہے تھے انہوں نے کلکتہ میں دو کالج قائم کئے ایک سنسکرت دہ ہندوؤں کے اور عربی و فارسی کا دکلکتہ مدرسہ مسلمانوں کے لئے اکبر سے لے کر اس وقت تک اس ملک کی تعلیم کا رنگ اور تھا۔ ہندو مسلمان ساتھ ساتھ ایک مکتب

میں ایک ہی استاد سے پڑھتے ۔ ہندو فارسی خواں عربی خواں اور مسلمان بھاشا
دان اور سنسکرت داں بنتے ایک کے ادب (لٹریچر) کا اثر دوسرے پر پڑتا ۔
اس سے ایک دوسرے کا غلام نہیں بلکہ بھائی بنا رہتا اس نئی تجویز سے جب دو الگ
الگ کالج کھڑے ہو گئے تو ہندو مسلمان بھی دو ہو گئے ۔ ایک مکتب میں ساتھ کی
تربیت بند ہوئی اور ملک میں دو طرح کی تعلیم کھل گئی ۔ دونوں نے آخر اپنی اپنی
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا اور اس پر فخر کرنا اپنا دین سمجھا ۔ یہ دوئی پھر تو بڑھتی
ہی گئی اور ذرا ذرا سی بات نمایاں ہوتی رہی ۔ یہ سیاست قدم قدم چلی اور
ہماری ذہنیت کو آہستہ آہستہ بدلتی ہوئی لیکے بڑھی ۔

ہماری ذہنیت کی ایسی خوبصورت تبدیلی کے بعد اب مغلوں اور ٹوڈر مل
کی دفتری زبان (فارسی) کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا مگر دانا جلد نہیں ہوتا
مچھلی زور کر کے نہیں پھنسائی جاتی ۔ تجربہ کار دریا میں اپنی ڈور چارا چھوڑ کر بیٹھ
جاتا ہے اور سانس نہیں لیتا ہے ۔ مچھلی نے چارا کھایا اور بھاگی ۔ سمجھی کر لے اڑے
مگر دانا شکاری اس وقت زور نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے ۔ مچھلی کے منہ میں
ڈور کا کانٹا ہے جائے گی کہاں وہ پانی میں دوڑی، دھوپ آخر تھکی گری اور مزے
میں پکڑی گئی ۔ سیاست کا جال بھی یوں ہی بچھایا اور غریب مچھلیوں کو پہلے چارا
دے کر تھکایا جاتا پھر نکال کر اس کا چھلکا ادھیڑ دیا جاتا ہے ۔

سرکاری دفتر سے اگر فارسی دفعتہً نکال دی جاتی تو کمپنی خطا کرتی اس
لئے پہلے اردو کا بازار گرم کرنا تجویز ہوا ۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا
گیا ۔ کچھ دن اس کا بھی زور رہا ملک اپنی ملکی زبان (اردو) کو منہ پھیلائے مانگ
رہا تھا ۔ اس کالج نے اعتبار جمایا اور بنگالہ سے پنجاب تک اس کا شہرہ ہوا ۔
دانائے فرنگ نے اب فارسی کو ہنس کر دیکھا اور آخر اُسے دفتروں سے

۱۸۲۵ میں خارج کر کے اردو کو اس کا قائم مقام بنایا گیا۔ گھر گھر چرچا اغاں کیا گیا۔ زبان کی یوں سروری پر بھولے بھالے ہندوستانیوں کی طرف سے ملک میں کمپنی کا ڈنکا پیٹا گیا۔

گلکرسٹ لوکٹ اور ٹیلر (ممبران سوسائٹی) کی اردو کے ساتھ وابستگی پر ہم اظہار خوشی کر سکتے ہیں مگر اس کے ماننے پر تیار نہیں کہ ان کی وہ سوسائٹی جو فورٹ ولیم کالج کے شاندار نام سے پکاری گئی۔ ہندوستانیوں کے لئے مفید اور اردو کے حق میں ایک کارنمایاں تھی۔ اس انجمن کا پہلا کام عربی فارسی اور سنسکرت و بھاشا سے صرف ان کتابوں کا اردو ترجمہ کرنا تھا جن کی طرف اس وقت ہندیوں کی رغبت تھی ایسے ترجموں کے کھیل تماشوں میں لگا کر ان قدیم ایشیائی زبانوں سے ہم کو چھڑانا اور ان کی ضرورت کو کم کرنا تھا پھر یہ کوشش صرف کمپنی کے اہلکاروں کی ایک خدمت تھی کہ وہ ان ترجموں کو پڑھ کر اس ملکی زبان (اردو) سے اتنے آشنا ہو جائیں کہ اپنے ہندوستانی نوکروں یا زیردستوں سے معمولی بات چیت کر سکیں اور بھوکوں نہ مریں یہ سوسائٹی کا مقصد واقعی اگر اردو کو پڑھانا ہوتا تو ہارون و مامون کی طرح اس زبان میں علوم و فنون کے ذخیرے بھی لے آتی اور اردو کو مالدار کر دیتی بیس پچیس برس کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا جاپان نے اس بیس پچیس سال میں اپنی زبان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس انجمن کا واقعی مقصد اگر اردو کی ترقی ہوتا تو ملک کی کروڑوں کی آمدنی سے اسے اتنا حقیر حصہ نہ ملتا کہ وہ بھوکوں مرتی اور اپنا معمولی کام بھی چلا سکتی۔ ابھی گلکرسٹ نے انگریزی اردو لغت (ڈکشنری) کے ترتیب دینے کی کوشش کی مگر وہ صرف اس لئے ادھوری رہ گئی کہ کمپنی نے مدد کی اور نہ ان کی قوم نے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مطلب کچھ اور ہی تھا۔

(ص ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱) مغل اور اردو مصنف نواب نصیر حسین خاں

کمپنی اور انگریز قوم کبھی ہندوستانیوں کی بہی خواہ نہیں رہے۔ ان کو کبھی بھی مشرقی کلچر سے انسیت نہ تھی بلکہ وہ اس کو ہمیشہ انگلش قوم کے لئے خطرہ سمجھتے تھے انھوں نے انگریزوں کو صرف اس حد تک مشرقی زبانوں کو سیکھنے کی اجازت دی جس سے وہ کار حکمرانی چلا سکیں۔ کیونکہ انہیں اس کا تجربہ تھا کہ مفتوح قوم کے کلچر میں کوئی قوم رنگ جاتی ہے تو اس کا وقار اور تمدن تک خطرے میں پڑجاتا ہے اور وہ اپنی جبلی خصلتوں تک کو بھول جاتی ہے اور اس کی وہ خوبیاں معدوم ہوجاتی ہیں جن سے اس نے محکوم قوم پر حکومت کی تھی۔ ان کو ڈر تھا کہ اگر انگریز اہلکار یہاں کے علم و زبان کو زیادہ پڑھیں گے تو ان کے رنگ اور تہذیب میں رنگ جائیں گے اور ہم آواز ہوجائیں گی اور اپنی تہذیب بھول بیٹھیں گے۔ اس کی ایک مثال بھی نواب نصیر حسن خیال نے اپنی مشہور کتاب مغل اور اردو میں پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مشہور مورخ مسٹر کین (کلکتہ ریویو آئے اور یہاں صفحہ ۶۱۸ ۵۹۷) میں لکھتے ہیں۔

"جیورج ٹومس یہ دو باپ بیٹے انگلستان سے ہندوستان آئے اور یہاں انھوں نے ہندوستانی سیکھیں اور یہاں کی تہذیب و معاشرت کا ایسا رنگ ان پر چڑھتا تھا کہ وہ اچھے خاصے ہندی بن گئے۔ چند ہی سال میں اپنی زبان تک بھولے اور جب لارڈ ویلزلی نے ان کا حال پوچھا تو کہا " ہم اپنی زبان فراموش کر گئے" اگر حکم ہو تو فارسی میں حال لکھ کر بھیج دیا جائے۔ (ص ۱۵۳) مغل اور اردو

ان تہذیبی اور قومی خطرات سے انگریز بخوبی واقف تھے اور انہیں وجوہات کی وجہ سے انگریز قوم ہمیشہ اپنے کو محکوم قوم سے الگ سمجھتی رہی اور

خود محکوم کو اپنے کلچر اور تہذیب میں سمو لینے کی کوشش میں لگی رہی۔ کیونکہ وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ زبان و ادب اور کلچر کی قوت سب قوتوں پر بھاری ہے اگر قوموں کو ذہنی اور فطری طور پر غلام بنانا چاہو تو ان کو اپنے کلچر میں رنگ دو ان میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ اس پالیسی کے تحت ہی انہوں نے اپنی تعلیمی پالیسی بنائی۔ فارسی اور اردو کو ہٹا کر انگریزی کو سرکاری زبان اس مقصد کے پیش نظر رکھ کر بنایا گیا۔ لارڈ میکالے کا ایما تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتا تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کہ بنگال میں ایک غیر عیسائی بھی نہیں ملے گا۔ انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے معاملہ میں میکالے کی بات کو ہی مانا گیا جب کہ بہت سے ممبران اس کے خلاف تھے اور اردو کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ایک ممبر مسٹر ڈم کریدتے اس وقت اردو زبان کے بارے میں یہ بیان دیا تھا۔

"اردو کی اس وقت یہاں بہ حالت بعینہ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصہ ملک سے دوسرے حصہ ملک تک بے تکلف جاؤ کسی مددگار کی ضرورت نہ ہوگی۔" (مغل اور اردو)

عله فروری ۱۸۳۵ء کی اپنی تعلیمی رپورٹ میں میکالے نے لکھا "ہمیں ہندوستان میں ایک ایسی جماعت تیار کرنی ہے جو ہمارے اور ہماری رعایا جن پر ہم حکومت کرتے ہیں کے درمیان ترجمانی کا کام انجام دے سکے اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن مذاق، رائے، خیالات، اخلاق اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"

عه بنگال میں اردو زبان و ادب از شانتی رنجن بھٹا چاریہ)

لیکن اُردو کو ترقی دینا یا سرکاری زبان بنانا تو کجا کمپنی اور انگریزوں کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا وہ اُردو اور فارسی کو مسلم کلچر کی جڑ بنیاد سمجھ کر اس کے بدترین دشمن تھے اور اس لئے وہ ہر وہ ترکیب استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جس سے اسے نقصان پہنچے انھیں حقائق کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ فورٹ ولیم کالج نقصان زیادہ اور مفید کم تھا اس نے قومی زبان کو دو ناموں میں تقسیم کر کے ہندی اردو کا جھگڑا شروع کر کے دیسی زبانوں کو صوبہ وار ترقی دے کر ایک لسانی جھگڑے کی بنیاد ڈال دی جو ملک کی یکجہتی کے لئے نقصان رساں تھی اور بن رہی ہے۔

اردو کو ۱۸۳۵ء کے بعد کچھ دن کے لئے سرکاری زبان بنا دیا گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا اس کو اس کے دو مشہور ادیب شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے الفاظ میں سنئے۔

ہوا ابھی یہی کہ اردو کو برقرار نہیں رکھا گیا جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۵۶ء سے بہت قبل ہی بنگال میں ایسے نوجوانوں کا بہت بڑا طبقہ وجود میں آ چکا تھا جو عدالتی اور سرکاری کاموں کو انگریزی زبانوں انجام دے سکتا تھا۔ یہ طبقہ دن بدن بڑھتا رہا۔ دوسری جانب مسلمان خوش تھے کیونکہ ان کے لئے کلکتہ کا مدرسہ موجود تھا اور عربی فارسی کی پرانی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ طوطے کی طرح عربی فارسی کو عوام سے جدا ہو کر رٹ رہے تھے۔ ادھر اردو کا قتل عام ہو گیا۔ اس لئے ۱۸۳۹ میں آخر کار عملی طور پر عدالتی زبان انگریزی بن گئی اور جو فارسی والے فارسی میں مست تھے اور جنھیں کلکتہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹی کا مقام مل رہا تھا۔ سب کے سب کان پکڑ کر باہر نکال باہر کئے گئے۔ اردو کو نہ تو مغل دور حکومت میں

مقام ملا اور نہ مغل حکومت کے زوال کے دور میں جو اس کی ترقی کا زمانہ کہا گیا ہے۔ فارسی کو عدالت سے ختم کرنے کا فیصلہ ۱۸۳۲ میں ہی ہو گیا تھا پھر بھی اس پر جلد عمل نہیں کیا جا سکا تھا۔ بہ ظاہر ۱۸۰۱ء یعنی میر امن کے دور سے ۱۸۳۹ء تک اردو نے ترقی ضرور کی لیکن اردو کو عدالتی زبان قرار دینے کی کوئی پرزور تحریک کل ہند پیمانے پر عوام میں جڑ نہ پکڑ سکتی تھی۔ جس کے کئی وجوہات ہیں سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان عالم اور صاحب قلم اور ایک کا جن کا تذکرہ میں مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں اردو سے کوئی محبت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں اردو کی تقسیم دو حصوں اور دو ناموں کی تقسیم پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ انھیں اردو سے کوئی محبت نہ تھی۔ وہ فارسی پر فخر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب کے دور تک یہی خیال رہا ہے غالب جو آج اپنی اردو شاعری کی بنا پر زندہ ہیں وہ بھی اردو سے زیادہ فارسی میں شعر کہنے پر زیادہ فخر محسوس کرتے تھے۔ اس دور کے تمام عالموں کا یہی حال تھا ۔ حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں وہ اردو ہی بولا کرتے تھے۔ لیکن لکھتے وقت فارسی ہی کو بہتر خیال کرتے تھے اور ہندو عالم بھی اردو کو لکھنے کی زبان کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کی اس دور میں آواز میں وقار تھا جن کی طاقت تھی۔ سب فارسی کے لئے روتے رہے اور فارسی کتابوں کو دل سے لگائے رہے اور ہوا یہ کہ فارسی جو عوام سے دور تھی صرف عالموں کے دلوں میں رہ گئی اور اردو جو عوامی زبان بن چکی تھی اسے اپنا مقام نہ ملا۔ وہاں بھی اردو عوام سے قریبی تعلقات ان فارسی داں عالموں کی وجہ سے پیدا نہ کر سکی۔ وکیل وغیرہ اس قسم کی فارسی نما اردو لکھا کرتے تھے جس کا تعلق عوامی زبان اردو سے نہ تھا۔ آج کے ادبی

اردو ادبی ہندی کے محافظ بھی یہی روش اختیار کئے ہوئے ہیں جو ادبی اردو اور ادبی ہندی کو عوام سے دور تر کرتی جارہی ہے"۔

(بنگالی ہندوؤں کی ادبی خدمات ۔ چھٹا باب)

اوپر کے چند صفحات میں میں نے سرسری طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے انگریزوں نے اردو کے ساتھ کیا کیا جبر یاں کیں اور اردو کے ارتقاء کے لئے ان کی کیا کیا پالیسی رہی اور کس طریقہ پر فارسی کو ہٹا کر صوبائی زبانوں کو فروغ دینے کے بعد وہاں کی زبان بنایا گیا اور اردو فارسی کی جگہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے مطابق انگریزوں اور صوبائی زبانوں کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں ہندی اردو کی تقسیم اور اُن کے دو نام رکھنے کے بعد کس طرح اس کو وجہ منافرت بنانے اور لسانی تعصب کو فروغ دینے کی کوشش یہ ایک لمبی روداد ہے اس موضوع پر ایک الگ ضخیم کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں بہت کم گنجائش ہے۔

پچھلے صفحات میں یہ تحریر کرچکا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اہل علم سب اردو رسم الخط اپناتے تھے۔ ناگری رسم خط جو کبھی برج بھاشا کے لئے استعمال ہوتا تھا اس کا رواج بھی ختم ہوچکا تھا۔ خود برج بھاشا بھی اردو رسم خط میں لکھی جاتی تھی جس کی مثال پچھلے صفحات میں مسعود حسن خاں ادیب کے کتب خانوں کے مخطوطوں

؎ حالات بدلے غلام ہندوستان پر لارڈ میکالے کی تعلیمی حکمت عملی کا جادو چلا! اختلاف ڈالو حکومت کرو (Divide and rule) کی پالیسی کے مطابق فرقہ پرستی کے زہریلے عناصر کے بیج بوئے گئے وہ ایک بڑے درخت کی طرح تمام ملک میں خوب پھیلا کر نتیجتاً زبان کا موضوع بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکا۔ مشمولہ شالی بھارت ماہ اگست ۱۹۷۴ء مضمون ہماری بھاشا مضمون نگاری ہنس راج اگروال

کی فہرست سے دے چکا ہوں۔ یورپ کی لائبریریوں میں اب بھی قدیم اردو
برج بھاشا اودھی کے رسیدوں اردو رسم خط کے مجموعہ آج بھی اس کا ثبوت پیش
کرتے ہیں کئی لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تلسی داس جی نے راماین بھی اردو
رسم خط میں ہی تحریر کی تھی۔ خیر ہو سکتا ہے یہ غلط ہو لیکن یہ اپنی جگہ درست
ہے کہ سینکڑوں برس سے اردو رسم خط ہندوستان کی مختلف زبانوں کے
لئے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ اس چیز کو دیکھ کر منشی سدا سکھ لال نے کہا تھا "رسم و
رواج بھاکا کا دنیا سے اُٹھ گیا" (ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۱۶۴۔ راجیندر شکل)
ہو سکتا ہے اس سے منشی جی کا مقصد رسم خط نہ ہو کر بھاکا زبان ہو کیونکہ اس وقت اودھی
برج بھاشا کو ناگری رسم خط میں بھی لکھتے تھے۔ اس لئے گلکرسٹ نے فورٹ
ولیم کالج میں ہندوستانی کے ساتھ برج بھاشا کا شعبہ بھی کھولا اور اس کے
لئے بھاکا منشی ملازم رکھا گیا اور بعد میں اس شعبہ کو ہندی شعبہ کا نام دیدیا گیا۔

اس بارے میں ڈاکٹر عبدالودود اپنی کتاب "اردو سے ہندی تک" میں
اس طرح رقمطراز ہیں۔

اُردو کے مقابلے میں دیوناگری میں لکھی جانے والی تحریر کو ابتداً کھڑی
بولی کہا گیا ہندی کا اردو کے حامیوں نے کھڑی بولی کی طرح طرح
سے تعریف کی ہے کچھ اہل قلم شدت جذبات کا شکار ہوئے اور
حد اعتدال سے گزر گئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ کھڑی بولی
کی اصل حیثیت کیا ہے اور کیسی کیسی غلطیاں اہل قلم سے سرزد ہوئی
ہیں۔

کھڑی بولی کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے للو لال جی سدل مشر
اور گل کرسٹ نے کیا ہے۔ للو لال جی پریم ساگر میں لکھتے ہیں۔

"ایک زمانہ میں بیاس دیو کی تخلیق شریمت بھاگوت کے دسویں حصے کی کہانی چتربھج مشر نے دوہے چوپائی میں برج بھاشا میں لکھی اس مدرسے کے لیے، مارکوئس ویلیزلی گورنر جنرل کی حکومت میں جان گل کرسٹ کی اجازت سے سمیت ۱۸۶۰ء میں للولال جی کوی برہمن گجراتی آگرے والے نے جس کی تلخیص نے مسلمانوں کی زبان (یا منی بھاشا) چھوڑ کر دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہ نام پریم ساگر کہا"

جان گل کرسٹ نے دی ہندی اسٹوری ٹیلر THE Hendi story (Teller دی ہندی رومن آرتھوا یپی گرافک الٹی میٹم

THE HINDI ROMAN EPEGRAPHIC ULTEMATEM)

میں کھڑی بولی کا ذکر کیا ہے۔

یہ جملے دیکھئے

"ان کہانیوں میں کئی کھڑی بولی یا ہندوستانی کے خالص ہندوی[1] طرز میں کی ہیں مجھے افسوس ہے کہ برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کو چھوڑ دیا گیا۔ ہندوستانی کا یہ طرز خاص یا اسلوب اس زبان کے طالب علموں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتا۔"

اصل کھڑی بولی میں ہندوستانی کی قواعد پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور عربی و فارسی کو تقریباً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شکنتلا کا دوسرا ترجمہ کھڑی بولی یا ہندوستان کی خالص بولی کا لفظ چھانٹ دیا جاتا ہے۔ Slerting Tanqueof India.

---

[1] یہ تھی اس قومی زبان کے لئے ہندو نظریہ سے سوچنے کی ابتدا۔ اس مفسدانہ تخیل کے ننھے پودے نے آگے جاکر شجر کی صورت اختیار کرلی ورنہ لسانی طور پر اس وقت تک دونوں فرقوں میں کوئی فرقہ وارانہ لسانی احساس نہ تھا۔ مصنف

"پریم ساگر کو جو ایک بہت ہی خوبصورت کتاب للولال جی نے ہمارے طالب علموں کے لئے ہندوستانی تعلیم کے لئے برج بھاشا کی خوبصورتی پاکیزگی کے ساتھ کھڑی بولی میں:

انگریزی ہندوستان کے ہندو عوام
کے وسیع طبقہ کے حقیقی استعداد کے نظریہ سے لکھا ہے۔"

صفحہ ۱۳۱: ۱۳۲ اردو سے ہندی تک

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ جان گلکرسٹ کا منشا کیا تھا اور قومی زبان ہندوستانی کو دو فرقوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کی کوشش پرتگال عیسائی مشنری اور وہ ایک ہندوستانی مصنفین پیشتر بھی کر چکے تھے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی تھی اب اس نے فورٹ ولیم کالج میں برج بھاشا کے شعبہ کی کامیابی نہ دیکھ کر للولال جی سدل مصر سے اردو کو ناگری رسم خط میں لکھوایا کیونکہ اردو اس وقت پورے ہندوستان میں سمجھی بولی اور اردو رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ رامچندر شکل بھی ان کی زبان کو اردو بتاتے ہیں۔ للولال جی پریم ساگر کی زبان کو اس کے دیباچہ میں دلی آگرے کی کھڑی بولی بتاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بولی کا پیشتر سے رواج تھا لیکن ڈاکٹر عبدالودود اس کی تردید فرماتے ہیں۔

للولال جی نے اپنی زبان کو "دلی آگرے کی کھڑی بولی" کہا ہے سدل مشر نے بھی "ناسکیتو پاکھیان" کو کھڑی بولی میں منتقل کرنے کی وجہ صرف یہ کہ اسے لوگ سنسکرت میں نہیں سمجھ سکتے گلکرسٹ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کو نظرانداز کیا گیا وہ کھڑی بولی کو ہندوستانی کا خاص طرز یا اسلوب کہتے ہیں انھوں نے کھڑی بولی کی ساخت پر اظہار خیال کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ "اصلی کھڑی بولی میں ہندوستانی کو قواعد پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور عربی و فارسی کو تقریباً چھوڑ دیا جاتا ہے" للو لال جی سدل مشر وگل کرسٹ وغیرہ نے ہندوستانی کو ہی کھڑی بولی تصور کیا ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ للو لال جی اور سدل مشر وغیرہ عربی و فارسی الفاظ کو علیحدہ کر دیتے ہیں"۔ یہ ہندوستانی اردو ہے۔ سدا سکھ شکل بھی اسے اُردو کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور راجہ شیو پرشاد کھڑی بولی کہتے ہیں ان حضرات کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مہذب شائستہ و تعلیم یافتہ آبادی لازماً ہی اپنی بات چیت میں عربی فارسی کے عام فہم الفاظ استعمال کرتی ہے۔ کھڑی بولی تحریک کی بنیاد ہی اس نظریہ پر تھی کہ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے ایک ایسی زبان کا رواج ہو جو اردو کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ تھی اسی لئے اِسے عربی فارسی الفاظ سے خالی زبان کو مولوی عبدالحق اور راجہ شیو پرشاد نے گنوارو بھاشا اس لئے کہا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ افراد ہی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں گلکرسٹ نے کھڑی بولی کو ہندوستانی کا ہندوانہ اسلوب کہا ہے ۔ وہ کھڑی بولی کو ہندوستان کی خالص بولی بھی کہتا ہے یعنی ایسی زبان جس میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش نہ ہو ایسی زبان پٹھانوں اور مغلوں کی آمد سے قبل رہی ہو گی۔ لیکن یہ اننا غلط ہو گا کہ یہ زبان وہی رہی ہو گی جو للو لال جی وغیرہ نے استعمال کی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اس زبان میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال اسی طرح ہوتا تھا جس طرح کہ کھڑی بولی کے ان نثر نگاروں نے کیا ہے ۔ جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ پراکرتیں اور اپ بھرنشوں سے اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے جن میں سنسکرت کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے کہنا یہ ہے کہ ایسی کھڑی بولی جس میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال زیادتی کے ساتھ کیا گیا ہو انگریزوں کی آمد سے قبل کبھی نہیں تھی جس کا ذکر للو لال جی نے پریم ساگر کے دیباچہ میں کیا ہے

اصلیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد سوچی سمجھی اسکیم کے تحت فورٹ ولیم کالج سے شروع کی گئی۔ اور کھڑی بولی ہندی (جدید ناگری ہندی) کو رائج کیا گیا پھر اس کے بعد اس نے جدید ہندی اور ناگری لپی کو کس طرح آہستہ آہستہ دفتروں اور عدالتوں میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی یہ بھی ایک الگ موضوع ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین صاحب ہندی ادب کی تاریخ ص ۱۶۶ پر رقمطراز ہیں کہ "دفتروں کی زبان ابھی تک فارسی چلی آتی تھی اُسے تبدیل کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ دفتروں کی ایک نئے سرے سے منظم کرنی پڑتی۔ نئے انگریزی داں اعمال بھرتی کرتے ہوئے سارا نظام ان انقلابی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا اس لئے فارسی ہی کو سرکاری زبان رہنے دیا گیا اور اس سے بھی تفرقہ اور ہندو مسلمانوں میں باہمی نفرت پھیلانے کا کام لیا گیا۔ عدالتوں کا کام فارسی میں ہوتا تھا لیکن ایک اطلاع نامہ آسان ہندوستانی اور ناگری لپی میں جاری کر دیا جاتا تھا۔ دو رسم الخط میں اعلان نامے نکلتے تھے ان کی زبان عام فہم اردو ہی ہوتی تھی۔ اس کا منشاء سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ اردو زبان کی ناگری رسم خط میں لکھنے کی ابتدا کی جائے۔ نمونہ یہ ہے۔

"اعلان نامہ بورڈ صدر۔ پچھان کے صدر بورڈ نے دھیان کیا ہے کہ کچہری کے سب کام فارسی زبان میں لکھا پڑھا ہونے سے سب لوگوں کو بہت ہرج پڑتا ہے اور بہت کلب ہوتا ہے اور جب کوئی اپنی عرضی اپنی بھاشا میں لکھ کر سرکار میں داخل کرنے پاوے تو بڑی بات ہوگی۔"

(ہندی ادب کی تاریخ ص ۱۶۷، ڈاکٹر محمد حسین)

موجودہ ہندی میں ناگری رسم الخط اور ہندی کے بارے میں انگریزوں کی روش

پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ چندر بلی پانڈے ایم۔ اے۔ نے ایک پوری کتاب ہی لکھڈالی۔ جس کا نام "کچہری کی بھاشا اور لپی ہے"۔ اس کے صفحہ ۴۲ پر وہ کمپنی سرکاری کی ناگری رسم خط کے بارے میں روش پر تحریر فرماتے ہیں اور ایسے اشتہارات کا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج ہو یا انگریزی حکومت سب ایک طے شدہ سازش کے تحت اردو کو تقسیم اور نقصان پہنچانے کی اسکیم بنا چکے تھے۔ ایک جانب ۱۸۰۱ء میں للو لال جی سے ناگری رسم خط میں کھڑی بولی ہندی میں کتابیں لکھوائی جا رہی تھیں تو دوسری جانب ۱۸۰۳ء میں عدالتوں کو ناگری لپی کی توسیع کے حکمنامے جاری کئے جا رہے تھے۔ کمپنی سرکار کی ہندی پرستی کی روش کے بارے میں اردو کے کٹر مخالف چندر بلی پانڈے فرماتے ہیں "کمپنی سرکار کی بھاشا نیتی پر ہم کر وچار کرنے کے لئے اوشک (ضروری) ہی نہیں بلکہ انواریہ (لازمی) بھی ہے کہ ہم یہاں اس کے کچھ آئینوں کو پیش کریں اور اسپشٹ دکھا دیں کہ بھاشا کے وشے میں اس کی نیتی کیا تھی۔ اتھوا کس پرکار وہ ہندی بھاشا تتھا (اور) ناگری لپی کے پکچھ (موافقت) میں تھی۔ کمپنی سرکار کا کہنا ہے "ضلع کے فوجداری کے صاحب لوگ کو لازم ہے کہ تھانہ دار کے تحصیلدار صاحب دار وغیرہ کو سند میں اس آئین کا ترجمہ فارسی بھاکا و اکچھر و ہندوستانی بھاکا و ناگری اکچھر میں دے وہ اس سند کا ترجمہ اوپر فوجداری مہر و اپنا دستخط کریں"۔ (۱۸۰۳ء سال ۳۴ آئین دفعہ ۱۲ انگریزی۔

(کچہری کی بھاشا اور لپی ص ۲۱)

پانڈے جی ہندی و ناگری نوازش کے بارے میں مزید فرماتے ہیں "ایک تو وہ (کمپنی) اپنی ماتر بھاشا انگریزی کو اپنا رہی تھی دوسری اور اپنی پرجا کی بھاشا ہندی کو سنوار رہی تھی سو کس طرح ذرا اسے بھی دیکھ لیجئے"۔ کلکٹر صاحب

کو لازم ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے مقررہ معیاد کا بھی کا نقل اپنے دستخط سے کیا انگریزی وا کے آدیسی زبان میں بورڈ آف ریونیو کے صاحب کے پاس بھیج دے۔"

انگریزی ۱۸۰۳ء سال ۱۳۱ آئین ۲۷، ۳ دفعہ (کچہری بھاشا اور لپی ص ۲۱)

کیونکہ اس زمانے میں اردو کو بھی ہندی کہتے تھے اس لئے ان اشتہارات میں ہندی لفظ سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ ہندی لفظ اردو کے لئے کہا گیا ہے۔ اس شک کو کوئی پانڈے جی ایک اشتہار کی نقل دے کر دور کر دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اردو زبان کو بھی ہندی ہی کہتے تھے۔ کیونکہ فارسی کے مقابلے میں وہ بھی ہندی ہی تھی ٹھیک ہے۔ ہمارا نمر نویدن (استدعا) ہے کہ آپ تو سمجھو آئینوں کا دھیان کریں اور دیکھیں کہ بات کیا ہے۔ اب تک آپ نے ہندی یا ہندوستانی بھاشا کے ساتھ ناگری اچھر کا دھیان دیکھا ہے۔ اب کرپا کر کے ناگری بھاشا اور ناگری لکھچھ کی دوستا بھی دیکھ لیجیئے "کسی کو اس بات کا عذر نہیں ہوئے کہ اوپر کے دفعہ کا لکھا ہوا حکم سب سے واقف نہیں ہر ایک ضلع کے کلکٹر صاحب کو لازم ہے کہ اس آئین کے پاونے پر ایک قطعہ اشتہار نامہ نیچے کے مشرح سے فارسی و ناگری بھاشا و اچھر میں لکھوائے کے مہر و دستخط اپنے ضلع کے مالکان زمین و اجیرادار جو حضور میں مالگزاری کرتا ان سبھوں کے کچہری میں و امین محال کے دوسی تحصیلدار لوگ کے کچہری میں لگوا دی۔"

(انگریزی ۱۸۰۳ء میں آئین ۳۱ دفعہ ۲۰)

اس بات کی تصدیق کہ کمپنی اردو کے مقابلے ناگری بھاکا (جدید ہندی) کی طرفدار تھی۔ رامچندر شکل بھی کرتے ہیں "کسی کو اس بات کا عذر نہیں ہوئے کہ اوپر کے دفعہ کا لکھا حکم سب سے واقف نہیں ہے ہر ایک ضلع کے کلکٹر صاحب کو لازم ہے کہ اس آئین کے پاویں کے پاونے پر ایک قطعہ اشتہار نامہ پہنچنے کے

شرح سے فارسی و ناگری بھاکا کے اکچھر دیں لکھائے کہ کچہری میں لکھوائی عدالت کے جج صاحب لوگ کچہری میں تمام آدمی کے پوچھنے کے واسطے لکھوائے "

(انگریزی آئین -۲ دفعہ ۳ - ہندی ساتہیہ کا اتہاس ص ۲۲۹)

اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہو گیا کہ ناگری رسم خط اور ناگری بھاشا (جسے بعد میں ہندی زبان کا نام دیدیا گیا) کو اردو سے جدا کرنے اور رسم خط کا رواج دینے کی سازش فورٹ ولیم اور عدالتوں میں ایک ہی وقت میں ارادتاً شروع کی گئی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام فورٹ ولیم کالج میں غیرارادی طور پر ہو گیا۔ اس خیال کے خلاف بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ سکوں پر محمود غزنوی نے تو ضرور سنسکرت میں کلمہ اور اپنا نام کھدوایا تھا لیکن ترک یا مغل سلطنت میں مہر اور سکے سب فارسی میں ہی تھے۔ اس کے لئے تین حکمنامے پیش کر رہا ہوں ۔

جو اسٹامپ اور ٹکسال کے لئے تھے - اسٹامپ اور سکوں پر پہلی بار ناگری حروف میں عبارت کھودی گئی ملاحظہ فرمایئں۔ " جو اسٹامپ سمبت کے دعوے دجواب گرہ کاغذ کے اوپر کیا جائیگا اس کے اوپر نیچے کا مضمون فارسی بھاکا کے اکچھر و ہندی زبان و ناگری اکچھر و میں کھودا جائے گا " (انگریزی رسالہ ۱۷۹۳ آئین ۳، دفعہ ۶ ص ۱۸۰ - ۹۱)

دوسرا حکم نامہ ملاحظہ فرمایئے ۔ " جو اسٹامپ سب کے عدالت کے کاغذ کے اوپر کی آجائے گا اس کے اوپر کا مضمون فارسی و بنگلا بھاکے وا کچھر و ہندوی زبان و ناگری اکچھر و میں کھودا جائے گا "

(انگریزی ۱۸۰۳ء سال - ۴۴ آئین (۱) تفصیل ۲ ص ۲۳ کچہری کی بھاشا اور لپی)

اس اشتہار سے ایک بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کمپنی سرکار کی جانب سے ناگری رسم خط میں لکھی جانے والی زبان کو ہندوی زبان کا خطاب ملا۔ کیونکہ اردو اس وقت تک ہندی کہلاتی تھی جب اس کا نام اردو رکھدیا گیا تو

اس جدید زبان کا نام ہندوی اور ناگری کے بجائے ہندی رکھ دیا گیا۔ بنگالی کو بھی صوبائی زبان کی حیثیت سے ابھارا گیا۔ اب ٹکسال یا سکوں پر ناگری لپی کھودنے کے سلسلے میں حکمنامہ سنئے۔" چندربلی پانڈے ایم اے کہتے ہیں کہ کاغذ اسٹامپ میں ہی نہیں، کمپنی سرکار نے ٹکسال میں بھی ہندی کو جما دیا۔ وہاں اس کو فارسی کے ساتھ جگہ ملی۔ اوپر کے بیکھا دفعہ سے شرح کے اشتہار پاونے سے اس کا نقل فارسی بجائے دانچھر و ہندوستانی بھاشا و ناگری اچھر میں لکھئے کے ٹکسال کے صاحب ٹکسال میں آدمی کے دیکھ ریکھ جا سے جیسے میں ٹکوا ہی دا انگریزی ۱۸۰۳ سال ۴۵ آئین ۸۱ دفعہ ۲۔ کچہری کی بھاشا اور لپی ص ۲۹ تفصیل) موصوف آگے لکھتے ہیں " مدراشاستر کے پر یکیوں سے یہ بات چھپی نہیں ہے کہ کمپنی سرکار سے کت آدیش کے انوسار جو سکہ بنا اس پر ناگری اچھر تو ہیں ہی دونوں طرف ترشول بھی بنا ہے۔" (کچہری بھاشا اور لپی۔ ص ۳۰)

یہ تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندی اور اردو کے بارے میں شروع سے پالیسی بلکہ گارسن دتاسی کے الفاظ کے یہ ہیں " ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کی یہ حکمت عملی رہی تھی کہ اردو کو ہندی سے علیحدہ تصور کیا جائے۔"

(خطبات ۵۲۶ لیکچر ۱۸۶۶ء)

اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کمپنی ہندی اور ناگری رسم الخط کو بڑھاوا دیتی رہی۔ اسکولوں میں اس کو لازمی کر دیا گیا ہے ۱۸۴۴ء میں محکمہ تعلیم کی جانب سے دہلی کالج کو لکھا گیا " ہندی زبان تمام طلباء کے لئے لازمی کردی جائے اس کو ارباب کالج اور دہلی سرکار نے پسند نہیں کیا۔ ۱۸۶۹ء میں ہندی کو بہار کی عدالتوں میں اردو کی جگہ رائج کر دیا گیا اردو کے حامی کچھ نہ کر سکے۔ انگلش مین کلکتہ نے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ حکومت نے ارادہ کیا ہے کہ بہار کے

ترشول ہندوؤں کی ایک مذہبی نشانی ہے

دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری کام ہندی زبان ناگری رسم خط ہوا کرے اس بوالعجبی کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ بہار کی رائے عامہ اس تبدیلی کے خلاف ہے۔ ایک یہ کہ صدیوں کے استعمال کی وجہ سے لوگ فارسی رسم الخط کے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسرے عدالتی یا تجارتی امور میں اردو کا رواج زمانۂ دراز سے ہے۔ ان اسباب کی بناء پر یہ تبدیلی نامناسب ہے لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں جارج کیمبل نے اسکول اور کالجوں میں بھی اردو کی تعلیم ممنوع قرار دے دی اور ہندی کی ترویج کے لئے ۴ لاکھ روپیہ منظور فرمایا۔ ۱۸۸۱ء میں مدھیہ پردیش میں ہندی کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ ہندی ریاستوں میں تو پہلے ہی ہندی زبان رائج کی جا چکی تھی ۔ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء میں اتر پردیش میں سرکاری کاغذات کو ناگری حروف میں جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر نے حروف ناگری کی قید لگائی تھی۔ لیکن ویسرائے بہادر لارڈ کرزن نے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان کا لفظ بنا دیا۔ مولانا عبدالحق صاحب مرحوم کے الفاظ میں وہ جو ذرا سا تسمہ لگا رکھا رکھا تھا۔ ظالم نے وہ بھی کاٹ کر رکھ دیا۔"

(خطبات عبدالحق ص ۲۸۷)

یہ تھا سرسری طور پر ایک جائزہ جو انگریزی ڈپلومیسی کا جو اس قومی زبان کے لئے جو ریختہ ہندوستانی ہندی ہندوی یا اردوئے معلی کہلاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت تھی جسے انہوں نے اپنا خون پسینے سے سینچا تھا کس کس فریب کارانہ اور متعصبانہ ذہنیت کے تحت اس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اور ان کے دو نام رکھ کر جیسا کہ ہندوستان سے

جاتے وقت انہوں نے ہمارے ملک کے ساتھ کیا) اور اسے دونوں فرقوں کے سپرد کیا گیا اور ہندوستان کے بدقسمت لوگ آج تک اس فریب کو نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں فرقے کے ارباب فرنگ کو اپنی اپنی زبان کے مہربان اور محسن خیال کرتے رہے۔

اب بھی ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج اور انگریزوں کو اُردو ہندی دونوں زبانوں کا محسن خیال کرتے ہیں۔

رہبروان کارواں کی سادگی بھی خوب تھی
رہزنوں کو قافلے کا رہنما سمجھا کئے

(کنول ڈبائیوی)

اُردو اور ہندی ناموں کے اثرات

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری زبان کے سوال نے یہاں بھی ایک پیچیدہ شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اگر جاپان انگلینڈ فرانس یا روس وغیرہ ملکوں میں اس موضوع پہ کوئی قلم اٹھائے تو پڑھنے والا اس کی عقل کا ماتم کرے گا اور وہاں کا مصنف لکھے گا بھی کیا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جاپان کی زبان جاپانی اور انگلینڈ کی زبان انگریزی اور فرانس کی زبان فرانسیسی اور روس کی زبان روسی ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں ہے لیکن انگریزی سرکاری کی پالیسی نے ہند میں اس سوال کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر اور پیچیدہ تر سے بھی پیچیدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات اس موضوع پر خاص اور رسائل واخبارات میں مضامین لکھے جا چکے ہیں تو بھی بہت سی وجوہات کی بنا پر موضوع جوں کا توں ہے ۔ ان وجوہات کے پیچھے اتہاس ہے۔"

۔۹ وشال بھارت ماہ اگست ۱۹۴۸ء مضمون ہماری بھاشا مضمون نگار

جس راج اگروال

فورٹ ولیم میں اس زبان کا داخلہ ہوا تو اسے صرف اُردو کا نام اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تاکہ دوسرے سب ناموں کو نظرانداز کیا جا سکے۔ جس طرح

ایک طالب علم کے اسکول میں داخلے کے وقت اس کا اپنا اصل نام لکھا یا جاتا ہے اور وہ اس نام سے آئندہ زندگی میں مشہور ہو جاتا ہے اور اگر گھر پر اس کے کچھ اور نام ہوتے بھی ہیں تو انھیں بھلا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج میں جب اس زبان کا ایڈمیشن ہوا تو اس کا نام کالج کے رجسٹر میں اردو لکھا گیا اور داخلہ کے فارم کے سرپرستی کے خانے میں مسلمانوں کا نام تجویز کیا گیا۔ اور اس زبان کے بطن سے ایک طفل کو بھی جنم دیا گیا جس کا نام پہلے ناگری ہندوی کھڑی بولی کا ہندوانی اسلوب اور بعد میں ہندی رکھ دیا گیا۔ سوگیہ ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی بھی یہی کہتے ہیں "کہ کھڑی بولی ہندی اردو سے پیدا ہوئی" (لسانی مطالعہ ص ۱۳۲) مولوی عبدالحق نے بھی یہی فرمایا کہ جدید ہندی اردو کا بچہ ہے جو فورٹ ولیم کالج میں پیدا ہوا" خطبات عبدالحق) اور بعد میں کس لاڈ و پیار سے اس نوزائیدہ طفل کی پرورش اور دیکھ بھال کیسے کی گئی یہ اہل ادب سے پوشیدہ نہیں ہے اور کچھ اس کے بارے میں پچھلے صفحات میں بھی تحریر کر چکا ہوں۔ اٹھارہویں صدی کے درمیان میں ہی بنگال میں سریرام پور میں عیسائی مشنریوں نے ۲۱ دیسی زبانوں میں کتابیں چھاپ کر اسکولوں اور عوام میں تقسیم کرایا۔ دو رخین کا کہنا ہے کہ صرف دس سال میں اتنی تعداد میں کتابیں چھاپی گئیں کہ اس کی نظیر ایشیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان میں پہلے پہل ناگری لپی میں بھی کتابیں چھاپی گئیں۔ ان کتابوں کی افزائش سے صوبہ پرستی اور فرقہ پرستی کو بڑھاوا ملا اور لسانی تعصب کی بنیاد پڑی۔ ۱۷۸۱ء میں کلکتہ مدرسہ کا صرف مسلمانوں کے لئے قیام صدیوں سے چلے آنے ہندو مسلم اتحاد کی زمین میں منافرت کی تخم ریزی کی ابتدا کر دیتا ہے۔ اس مدرسہ کے قیام کے چھ برس بعد سر ولیم جونز کو سنسکرت قواعد کی جامعیت اور لاطینی اور یونانی زبانوں سے مشابہت اور مناسبت نے متاثر کیا اور انہوں نے

کافی دلچسپی اور جوش کے ساتھ سنسکرت کی ازسرنو بازیافت کا بیڑا اٹھایا یورپ میں بھی سنسکرت کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ سنسکرت کی اس قدردانی نے بعض ہندوؤں کے ذہنوں کو اکسایا اور ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کے قیام سے ایک جانب انگریز ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان میں مسلمانوں سے جدا ہونے کا احساس پیدا کرنے کا کام کیا تو دوسری جانب اُن کے ذہنوں میں بٹھا دیا کہ تمہیں (ہندوؤں کو ہندوستان میں سربلند ہونا اور اقتدار حاصل کرنا ہے) تو سنسکرت اور اس کے کلچر کو ترقی دو اور ہندوؤں کو بدیسی فارسی کلچر سے دور ہٹانے کی کوشش کرو اس سے ہندو قوم کا سیاسی معاشی اور سماجی طور پر فائدہ ہوگا اور مستقبل میں ہندو معاشرے کو سنسکرت نما ہندی سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ جیسے بنگالیوں نے مسلم بنگالی کو ترک کر کے اٹھایا اس وقت بھی موجودہ صورت میں مدراسی لوگ انگریزی کو ملک سے ہٹانے کے اس لئے مخالف ہیں کیونکہ صوبہ مدراس (تامل ناڈو) اور صوبوں کی بہ نسبت انگریزی میں آگے ہے اور انگریزی کا ہٹانا انکی معاشی زندگی پر اثر انداز ہوسکتا ہے اس لئے انہوں نے انگریزی کی موافقت اور ہندی کی شدید مخالفت کی ہے یہی خیال شروع سے ہندوؤں کے ذہن میں سمو دیا گیا کہ سنسکرت نما ہندی ہندو کلچر کے لئے منفعت کے علاوہ معاشی طور پر بھی مفید ثابت ہوگی یہ بنیادی خیال تھا جو ۱۷۹۱ء سے ہی ہندوؤں کے دلوں میں ڈالا جانے لگا۔ دوسری جانب بنگالی ہندوؤں کو انگریزوں نے سنسکرت نما بنگالی کو ترقی دے کر اور انھیں اس سے معاشی اور سماجی فائدہ پہنچا کر مثال قائم کر دی تھی۔ اب سوچی سمجھی اسکیم کے تحت فورٹ ولیم کالج میں ہندی کی درسی کتابوں کے لکھنے کے اہتمام سے ایک اور لسانی تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جس نے آگے چل کر مشترکہ زبان کے

اردو اور ہندی کی شکل میں دو ٹکڑے کر دیئے۔

فورٹ ولیم کالج کی سازش سے پہلے پورے ہندوستان کی قومی زبان ایک تھی باوجود انگریزی سازشوں کے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک یہ ایک رہی۔ ہندو مسلمان[1] برابر اس قومی زبان کی ترقی میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۷ء تک سنکڑوں کتب ہندو مسلمانوں نے مل کر اس مشترکہ زبان میں تخلیق کیں اور اخبارات نکالنے میں ان کتابوں کا ذکر کر کے مضمون کو زیادہ طویل نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۷ء یعنی بارہ سال تک ان اخبارات کی فہرست درج کرتا ہوں۔ جن کے مدیران ہندو تھے۔

۱۔ قرن السعدین۔ مدیر معصوم نرائن۔ تاریخ اجراء ۱۸۴۵
۲۔ "محب ہند" دلی ماسٹر دھرم چند ۱۸۴۷ء
۳۔ فوائد المناظرین۔ مدیر ماسٹر رام چندر ۱۸۸۶ء
۴۔ "فوائد الشائقین" بجھو دیال ۱۸۸۶ء، دہلی
۵۔ "سدھاکر اخبار" بنارس تارا موہن ۱۸۴۸ء
۶۔ "گوالیار اخبار" لکشمی پرشاد گوالیار ۱۸۴۸ء

---

[1] اس موضوع پر ڈاکٹر احتشام حسین اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"جب کھڑی بولی اردو کی شکل میں ترقی کر گئی تو ہندو مسلمان دونوں اس کے گرد جمع ہو گئے کسی نے اسے یہ کہہ کر نہیں ٹھکرایا کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تارا چند کے خیال میں اٹھارہویں صدی میں ہندو مسلمان دونوں اردو کو ایک مشترک زبان سمجھتے تھے۔ صفحہ ۱۱/۶ مقدمہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

۷۔ "بنارس اخبار" رگھوناتھ گھوش ۱۸۴۸ء

۸۔ "مخزن الاخبار" بریلی لچھمن پرشاد ۱۸۴۸ء

۹۔ "مالوہ اخبار" دھرم نرائن اندور ۱۸۴۹ء

۱۰۔ "الحقائق" آگرہ۔ موتی لال ۱۸۴۹

۱۱۔ "کوہِ نور" منشی ہرسکھ رائے ۱۸۵۰ء

۱۲۔ "خورشید عالم" سیالکوٹ۔ منشی دیوان چند ۱۸۵۰ء

۱۳۔ "باغ و بہار" بنارس۔ مہاراجہ بنارس ۱۸۵۱ء

۱۴۔ "نور الابصار" آگرہ۔ منشی سدا سکھ لال ۱۸۵۳

۱۵۔ "آفتاب ہند" بنارس۔ بابو رگھوناتھ ۱۸۵۲ء

۱۶۔ "مفید اخبار" آگرہ۔ شو نرائن ۱۸۵۰ء

۱۷۔ "خلاصۃ الاخبار" دہلی۔ متھرا داس ۱۸۵۱ء

یہ اس وقت کی فہرست ہے جب کہ شمالی ہندوستان میں اخبارات اور چھاپے خانوں کا رواج نیا نیا تھا۔ پڑھے لکھے افراد کی تعداد بھی محدود تھی اس کے بعد سے ہندوؤں نے اتنے اخبارات نکالے کہ جن کی تعداد بھی شمار کرنا مشکل ہے چند مشہور اخبار یہ ہیں۔

"اودھ اخبار" لکھنؤ۔ "اخبار عالم" لاہور" "ملاپ" لاہور" پرتاپ" لاہور" شیر پنجاب" لاہور "تیج" دہلی "شیر دکن" حیدر آباد۔

ہفتہ وار اخبار ہیں "تفریح" لکھنؤ۔ "آزاد" کانپور "طوطی ہند" دہلی اور ماہنامہ زمانہ کانپور، "زبان" دہلی۔ "ادیب" الہ آباد "خدنگ" لکھنؤ "رہنمائے تعلیم" لاہور، مستانہ جوگی ۰ لاہور، "نرالی دنیا" لاہور۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک زمانہ تھا کہ برصغیر ہندوستان میں اردو اخبارات اس ملک کی تمام زبانوں سے زیادہ شائع ہوتے تھے۔ آج بھی اس کے انحطاط کے دور میں بھی ہندوستان میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ہند سماچار جالندھر ہے جو اُردو زبان میں نکلتا ہے اور اس کا تمام عملہ بھی ہندو ہے۔ اُردو زبان نے ہندوستان کی ایک کثیر اور منتشر آبادی اور مختلف زبانیں رکھنے والی آبادی کو باہمی تبادلۂ خیال اور بول چال کے لئے ایک وسیلہ یا ذریعہ دیا۔ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل جوڑنے اور دونوں کو ایک مشترکہ زبان کا تحفہ دیا جو حضرت امیر خسرو ۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ کے زمانے سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کے ایک بڑے حصہ کے عوام اور خواص کی محبوب و مرغوب زبان رہی جس کا چلن صدیوں سے گلیوں، بازاروں میلوں ٹھیلوں، خانقاہوں، نرگن بھگتوں، محلوں اور درباروں تک میں تھا انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا: صفحہ ۵۰۷ جلد ۱۱ ۱۹۲۵ء میں لکھا ہے "۱۵۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک اردو بول چال اور ادب کی زبان کی حیثیت سے اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یعنی مسلمانوں میں جتنی یہ مقبول و مروج تھی اتنی ہی ہندوؤں میں بھی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہندو مسلم اتحاد کی واضح تصویر جنگ آزادی کی شکل میں دیکھنے کے بعد جسے انگریز نے غدر کا خطاب دیا تھا انگریز نے لسانی تفریق کی پالیسی کی مہم کو اور تیز کر دیا۔ ۱۸۵۸ء کے بعد کمپنی بہادر

ڈاکٹر عبدالمعبود اپنی کتاب "اردو سے ہندی تک" میں اس موضوع پر بھی اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" اردو کی مخالفت کی بنیادیں بڑی گہری ہیں۔ پہلی جنگ آزادی تاریخ ہند کا اہم (باقی ۱۲۳ پر)

برخاست ہوئی، انگریزی راج نے پلٹا کھایا۔ جدید قانون نافذ کئے گئے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)
واقعہ ہے۔ انگریز اہل ہند کے اتحاد کا شاندار مظاہرہ دیکھ چکے تھے انھیں کامیابی آسانی سے حاصل نہ ہوئی تھی۔ انگریز سیاست دانوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں حکمرانی اس وقت تک ممکن نہ ہوگی جب تک ملک میں اتحاد قائم رہے گا۔ جہاں بھی ممکن ہوا یہ کوشش کی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کا مخالف بنادیا جائے فرقہ وارانہ رجحانات پیدا کرنے کی جو کوشش دانایانِ مغرب نے کی اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ برصغیر کی تقسیم کے پیچھے جو طویل داستان ہے اس سے ہم سب واقف ہیں اردو اور ہندی کا جھگڑا اسی قسم کا عطیہ ہے جو دانایانِ مغرب نے ہمیں دیا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انگریزوں کی آمد سے ملک میں انگریزی کا فروغ ہوا۔ مکمل طور پر حکومت قائم کرنے کے بعد انگریزی کے فروغ کے اور مواقع ہاتھ آگئے۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ مخالفت اس زبان کی گئی جو اس سرزمین پر جنم لے کر ترقی پذیر ہوئی۔ اردو کے مخالفین نے انگریزی کے خلاف آواز بلند نہ کی جو کہ قطعی غیر مانوس اور غیر ملکی زبان تھی"۔ ص ۵۹۔

جدید ہند آریائی زبانوں کی جو خاندانی تقسیم گریرسن نے کی ہے۔ ہمارے ماہرینِ لسانیات اس کے مقلد اور ہم نوا ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ تقسیم گمراہ کن ہے اس نے ہندی کو بڑھاوا دینے میں بہت کچھ مدد کی ہے۔ مغربی ہندی اور مشرقی ہندی میں اودھی میتھلی چھتیس گڑھی، بندیلی، قنوجی، برج بھاشا اور ہندوستانی ناگری ہندی اور اردو کو شامل کر کے جہاں ہندی کا دائرہ وسیع بنادیا ہے اردو کو اس دائرے میں شامل کر کے اس کی شیلی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ہندی کے مورخین نے کافی فائدہ اٹھایا اور انھیں ہندی اردو

جو آگے تھے وہ پیچھے ہو گئے جو پیچھے تھے وہ آگے ہو گئے ۔ ہندو

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ)
کے قضیہ کو ہوا دینے کی ایک اور راہ ملی ۔

بھارتیندو ہریش چندر کا عہد اُردو کی مخالفت کا پہلا دور ہے ۔ کھڑی بولی
کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کا تجربہ پہلی بار فورٹ ولیم کالج میں کیا گیا تھا
لیکن بہت عرصہ تک کالج کی چہار دیواری کے باہر اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی
اس زمانہ میں اُردو کے علاوہ دوسری اہم زبان برج بھاشا تھی ۔ برج بھاشا کے
مقابلے میں کھڑی بولی کا اردو روپ ارتقا کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا ۔ اس لئے
یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اُردو میں ترمیم کرنا بے سود ہوگا ۔ فورٹ ولیم کالج میں جو
تجربات کئے گئے ان کی تجدید بھارتیندو ہریش چندر نے کی ۔ ایک طبقہ تجربات اور
متضاد رجحانات نا مانوس الفاظ کے استعمال کا مخالف تھا اور دوسرا طبقہ اردو
زبان اور اردو رسم الخط کا سخت مخالف تھا ۔ ص ۹۲

بھارتیندو ہریش چندر کے عہد میں جس ادب کی تخلیق ہوئی اس میں ایک
فرقہ کو نشانہ ملامت بنایا گیا ہم جب اس زمانہ کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو
دیکھتے ہیں کہ کس طرح متنازعہ موضوعات پر اشعار و مضامین لکھ کر دو اہم فرقوں
کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان موضوعات کا ہمارے موضوع
سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ہم صرف زبان کے مسئلہ کو ہی پیش کر رہے ہیں ۔

اس عہد کے ڈرامہ نگاروں نے ہندی اور اردو کے موضوع پر ڈرامے
لکھے ۔ یہ ڈرامہ صرف ادب کا جز بن کر نہ رہ گئے بلکہ انھیں اسٹیج بھی کیا گیا اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی مخالفت عوامی سطح پر بھی کی جانے لگی ۔ شری نخچے مل کا ستیہ
دیوناٹک پنڈت دوی دت شکل کے دیو اکشر چولا چر تر رام غریب چترویدی کا ناگری

طبقہ انگریزی تعلیم میں مسلمانوں سے آگے تھا۔ اس لئے وہ حکومت کے تمام

دلاپ اور رتن چند وکیل کا ہندی اُردو ایسے ہی ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں ہندی کو اُردو سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اردو رسم الخط پر بھی اعتراضات کئے گئے بھارتندو ہریش چند کے عہد میں اُردو مخالفت کی جو روایت پڑ چکی تھی وہ ختم نہ ہوئی بلکہ اس کی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہو گئیں۔ تقریباً ان تمام تصانیف میں جو ہندی کے آغاز اور ارتقاء سے بحث کرتی ہیں چندر بلی پانڈے کا ذکر کسی نہ کسی طرح آجاتا ہے۔ انھوں نے اردو کے بارے میں جس قسم کے زہریلے اور منافرانہ خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اردو کا ادگم کچہری کی بھاشا اور لپی اردو زبان اُردو کا رہسیہ اور بھاشا کا پرشن ان تصانیف میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو ایک درباری زبان ہے اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ ص ۶۲-۶۳

ان تصانیف اور پروپیگنڈے کے اثرات دور رس ہوئے یہاں تک اردو کے چند چوٹی کے ادیبوں کا جن کا ذکر میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے کروں گا اور مشہور ماہر لسانیات سونیتی کمار چیٹرجی تک بھی ان سے بے حد متاثر ہوئے اور خود کو اس پروپیگنڈے سے محفوظ نہ رکھ سکے اور چندر بلی پانڈے جیسے مصنفین کے ہمنوا بن گئے اور انھوں نے زبان کے لئے ہندو ہندی اور مسلمانی اردو کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ حالانکہ آزادی کے بعد ہندی اور اُردو کے بارے میں ان کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔

اداروں پر چھا گیا اور مسلمانوں میں اپنی قدامت پسندی اور انگریزی زبان
سے نفرت کی بناء پر بہت پیچھے رہ گئے۔ ہندوؤں میں[1] قومیت کا جذبہ کچھ
انگریزوں کی پچھلی منافرانہ پالیسی کے تحت اور کچھ کالجوں کی تعلیم، آزادی
حب وطن، تقریروں، تحریروں، انصاف پسندی کے اعتقاد اور آبادی کی اکثریت
کے اعتماد نے قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو ابھارا اور ان میں شاندار

---

[1] ڈاکٹر احتشام حسین مرحوم نے اس موضوع پر اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں کبھی اور کسی جگہ زبان کے مسئلے نے یہ شکل نہیں اختیار کی جو آج
ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے۔ یا بعض وجوہ سے پیدا کی گئی ہے۔ رجعت پسندی گروہ
حب الوطنی فرقہ پرستی لاعلمی بدنیتی اور کسی حد تک علمی اور عملی دشواریاں اس مسئلہ کی تہہ میں
ہیں۔ پڑھے لکھے جاہل اپنی سیاسی اغراض کے لئے زبان کو مذہبی بنا رہے ہیں جو تاریخ میں کبھی
نہیں ہوا۔ اسے ہر وہ ملک جھٹلا سکتا ہے جہاں کئی مذہبوں کے لوگ بستے ہیں لیکن
زبان کے مسئلہ میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر ہندوستان میں ایسا کیوں ہے؟ جب
تقریباً آٹھ سو سال کی کوشش کے بعد عام بول چال کی ایک ایسی زبان بنی تھی جو
کسی مخصوص مذہب یا طبقے سے وابستہ نہیں تھی۔ جو قومی وحدت کی شیرازہ بندی
کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی جو صدیوں میں بسنے والوں کی آزادی اور ترقی کی خواہش
کے اظہار کے لئے پیدا ہوئی تھی اس کے ہوتے ہوئے پھر ایک قومی زبان کا مسئلہ
کیوں پیدا ہوا۔ یہ بات الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ کھڑی بولی کے روپ میں ایک ایسی
ہندوستانی زبان بن گئی تھی جو جغرافیائی اور محدود لسانی تبدیلیوں کو توڑ کر
صوبجاتی زبانوں کو نقصان پہونچائے بغیر مشترک قومی زبان کا کام دے رہی تھی
لیکن انیسویں صدی میں جب انگریزی سیاست نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں

قومیت اور ماضی کی شاندار تہذیب کا جوش پیدا کیا۔ جیسے مسز اینی بیسنٹ سوامی دیانند سرسوتی وغیرہ نے ایک کلچر ایک سنسکرت ہندو ہندی ہندوستان کے جذبہ کا تصور پیش کر کے اس جذبہ کو دلوں میں اور مستحکم کر دیا۔ گروکل قائم ہوئے۔ جن میں سنسکرت پڑھنا، سنسکرت بولنا لازمی تھا۔ ویدک معاشرت کی نقل

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) تفریقی رجحانات کو بڑھایا۔ نئے متوسط طبقے نے اصلاحی تحریکیں پیدا کیں جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں الگ الگ اصلاح کا کام شروع کیا ہندو اور مسلم قوم پرستی کا جداگانہ جذبہ پیدا اس وقت زبانیں بھی مذہب کی ترازو پر تولی جانے لگیں۔ فورٹ ولیم کالج میں پہلی اہم ہندی نثر کی کتاب ایسی ہندی میں لکھوائی گئی جو قدیم ہندی کی کسی ادبی شاخ سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ بعض معمولی کوششیں ہوئی تھیں اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں منشی سدا سکھ لال نے سکھ ساگر لکھی تھی جس کی بنیاد کھڑی بولی پر تھی۔ لیکن جب للو لال جی سے پریم ساگر لکھوائی گئی اس وقت سے جدید ہندی یا ادبی ہندی کی بنیاد پڑی اب تک ہندی کوئی مخصوص زبان نہیں تھی۔ اودھی برج بھاشا بھوجپوری بندیلی بہاری وغیرہ سب الگ الگ ملا کر ہندی جا سکتی تھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں انھیں کسی رسم الخط میں اپنے علاقائی یا لسانی تعلق کی وجہ سے لکھتے تھے۔ لیکن کھڑی بولی صرف اس شکل میں رائج تھی کہ ہو تو کھڑی بولی لیکن اس کو وسیع بنانے کے لئے اس میں حسب ضرورت فارسی الفاظ شامل کئے جائیں۔ جدید ہندی اس طرح بنائی گئی کہ ارتقائے لسان کی روایتوں سے ہٹ کر کھڑی بولی میں فارسی کی جگہ سنسکرت کے الفاظ شامل کر لئے گئے ہندی بھاشاؤں کی یہ عام خصوصیت قرار پائی کہ اس میں سنسکرت تت سم الفاظ کم پائے جاتے تھے۔ جدید ہندی کی یہ خصوصیت

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی جانے لگی۔ ہندو قومیت کے جذبہ کا رنگ ہندو قوم میں بھرنے کی کوشش کی گئی۔ بنارس الہ آباد میں اس تحریک نے دو صورتیں اختیار کیں۔ راجہ کشن سنگھ ہندی زبان کو انگریزی کی ۱۸۲۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھپائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قرار پائی کہ اس میں سنسکرت تت سم کی بھرمار ہو اور وہ اپنے لسانی ارتقاء اور روایتی تعلقات کے لحاظ سے جدید ہند آریائی بھاشاؤں سے بالکل قریب تھی۔ جدید ہندی اس ارتقائی عمل کا انکار کر کے سنسکرت سے نیا رشتہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ نئے قومی تصورات اور قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کی خواہشات نے اس کے لئے وجہ جواز بھی فراہم کر دیا۔

یہ غور کرنے کی بات ہے کہ جب انیسویں صدی میں نئی ہندو قومیت نے جنم لیا۔ اور اسے ایک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو حالات اتنے بدل چکے تھے کہ اس نے برج بھاشا اور کسی جدید پراکرت کو اپنی زبان نہیں بنایا بلکہ ہندوستانی کھڑی بولی ہی کو نئے ادبی ہندی کی بنیاد قرار دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس درمیان میں کھڑی بولی کی یہ شکل اردو یا ہندوستانی کے نام سے عام ہو چکی تھی اور دوسری پراکرتیں مقامی بولیوں کی حیثیت اختیار کر کے اس کی ترقی اور عمومیت کے سامنے پسپا ہو گئی تھیں۔ لہٰذا ان کے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا وہ اپنے ہندوستانی یا اردو سے الگ کرنے کے لئے یہی کر سکتے تھے کہ اس میں فارسی عربی کے مستعمل لفظوں کے بجائے سنسکرت کے الفاظ داخل کر دیں۔ ایک حد تک سنسکرت کے الفاظ شامل کرنا غلط نہ تھا کیونکہ اس طرح کلچر کی وہ وحدت مجروح نہیں ہوتی تھی جس کی صدیوں میں تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن عام مستعمل الفاظ

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہوئی ٹھیٹ سنسکرت نما ہندی کتابوں کے نمونے کی ہندی بنانا چاہتے تھے یعنی سنسکرت آمیز ہندی اور دیوناگری رسم خط چاہتے تھے لیکن راجہ شوپرشاد

(بقیہ ص گذشتہ) کو ترک کر کے انھیں لینا غلط تھا۔ اس سے بھی زیادہ یہ رجحان غلط ثابت ہوا کہ سنسکرت کی بھرمار کی جائے۔

فارسی آمیز اردو اور سنسکرت آمیز ہندی کی وہی حیثیت ہے جو ملک کے طبقاتی ڈھانچوں کی ہے۔ فارسی عربی اور سنسکرت کے عام فہم الفاظ کے ساتھ کھڑی بولی ہندوستان کے عوام کی زبان ہے۔ زیادہ فارسی آمیز کھڑی بولی مسلمانوں کے اونچے طبقے کو پسند آتی ہے۔ زیادہ سنسکرت آمیز ہندی قوم پرست اونچے طبقے کے ہندوؤں کے دل میں جگہ کرتی ہے اس طرح اردو ہندی کے بنیادی حصہ میں وحدت ہے صرف اوپری ڈھانچہ میں فرق ہے۔ احیائے تہذیب کے جوش نے مشترک حصہ کو نظرانداز کر کے تفریق پیدا کرنے والے حصہ کو اور بڑھایا اس طرح ہندی اردو کا جھگڑا اکھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ماننے والوں نے ایک دوسرے پر اعتراض کر کے اور پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ جدید ہندی کے کھڑی بولی پر مبنی ہونے سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ جدید ہندی مشترک زبان کی بنیادوں سے قریب رہی اور زبردست اوپری اختلافات کے باوجود لسانی حیثیت سے وہی چیز ہے جو اردو لیکن نقصان یہ ہوا کہ فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی نکالے جانے لگے جو عام زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور مشترک سرمایہ کا جز رہتے اور انکی جگہ نامانوس سنسکرت لفظوں کو دی جانے لگی۔ یہ لے آتی بڑھی کہ وہ ہندی الاصل لفظ بھی نکال دیئے گئے جو عہد قدیم سے شاذوں سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوستانی کے حامی تھے وہ زبان کا صرف رسم خط ہی بدلنے کے خواہاں تھے۔
انھوں نے جو بنارس سے دیوناگری لپی میں اخبار نکالا۔ اس کے بارے میں رامچندر
شکل کہتے ہیں کہ اس کی زبان اردو تھی لیکن رفتہ رفتہ راجہ لچھمن سنگھ کی
سنسکرت نما کھڑی بولی ہندی کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور
اور انھوں نے کھڑی بولی ہندی کو بنگالی کے تتبع میں شان خودداری اور قدیم
تہذیب کے لئے ضروری اور ہندو قوم کے ارتقاء کے لئے اہم سمجھا۔ ۱۸۶۱
میں بریلی سے ہندی کا پہلا ہفتہ وار اخبار "بریلی بودھنی پتریکا" جاری ہوا۔
اس زمانے میں بنگالی زبان کو بنگال کی عدالتوں میں عدالتی زبان کی حیثیت
دیدی گئی اور ۱۸۸۶ء میں ہندی کو بہار کی عدالتوں میں زبردستی ہندی کو
رائج کردیا گیا اور ۱۸۷۱ء میں لفٹننٹ گورنر مسٹر جی۔ بی کمپبل نے ایک
ایڈریس کی فارسی نما اردو سے چڑکر بہار کے مدرسوں میں اردو کا پڑھانا
ممنوع قرار دیدیا۔ اس کے کچھ دن بعد مدھیہ پردیش کی زبان ہندی قرار دیدی
گئی۔ ان نظیروں سے متاثر ہوکر شمالی مغربی اضلاع میں ہندوؤں میں بھی یہ
خیال زور پکڑ گیا کہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی ہندی کو یہاں
کی عدالت کی زبان بنایا جائے اور ۱۸۸۸ء میں جب سرسید محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس بلائی ۱۸۹۲ء میں ہندوؤں نے ناگری پرچارنی سبھا قائم کی۔ بابو
شیام سندر داس نے جو اس وقت اس سبھا کے منتری تھے۔ پورے ملک کا

(بقیہ ص گذشتہ) لئے گئے تھے۔ یا سنسکرت کے وہ لفظ تھے جو بھوپن کر خالص تت سم نہیں
رہ گئے تھے۔ ایسے لفظوں کو پھر سنسکرت تلفظ دے کر اجنبی بنایا جانے لگا ۔ ص ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۶

۱۵۔ مقدمہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از ڈاکٹر احتشام حسین

دورہ کیا اور ساٹھ ہزار افراد کے دستخطوں کے ساتھ ایک محضر نامہ تیار کر کے مہاراج نرائن راجہ اجودھیا کے ذریعہ سرانٹونی میکڈانل کو ۲ مارچ ۱۸۹۹ء کو پیش کیا گیا جس کے نتیجہ میں ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک حکم نامہ جاری ہوا جس کی رو سے عدالتی کاغذات دونوں زبانوں میں جاری کئے جانے کی ہدایت دے دی گئی۔ اس کی بھی اجازت دی گئی کہ دیوناگری رسم خط میں عرضیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہندی کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اب تک یہ ادارہ اردو کا علاقہ تھا۔ اب یہ دو لسانی علاقوں میں منقسم ہو گیا۔ ابتدا میں یہ تقسیم لسانی تھی جو رفتہ رفتہ اور بھی گہری ہوتی گئی۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ملک میں فرقہ واریت اور بڑھتی گئی۔ آریہ سماج کی مذہبی تحریک کی وجہ سے پنجاب کے گھرانوں میں ہندی کا چلن بڑھا۔ ہندو ریاستوں میں ایک ایک کر کے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنانا شروع کر دیا۔ گجراتی والی ریاست بڑودہ اردو والی ریاست الور سے لے کر کشمیر اور راجپوتانہ جہاں شاہی زمانہ سے فارسی اور بعد میں اردو میں کام ہوتا تھا نے اسی جذبہ کے تحت ہندی کو سرکاری زبان بنایا۔ بابو ایودھیا پرشاد کھتری کھڑی بولی ہندی کے پرجوش مبلغ تھے وہ گاؤں گاؤں شہر شہر جھنڈا لئے گھومتے اور ناگری کا پرچار کرتے تھے۔ ان سب باتوں نے ہندی کے ہندو نام کی ہندو قوم سے جذباتی ہم آہنگی نے اچھے اچھے اردو پرستوں کے ایمان کو متزلزل کر دیا۔ یہاں دو ایک مثالیں مشہور ادیبوں کی پیش کر رہا ہوں منشی پریم چند جن کو اردو ہی نے ایشیا کا مشہور افسانہ نگار بنایا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۱۹۷ اپنی کتاب اردو زبان کے المیہ میں لکھتے ہیں۔ "پریم چند دو لسانی مصنف تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز اردو مصنف کی حیثیت سے کیا تھا اور اردو ہی ان کی

پہلی زبان تھی۔ اردو بھی رفتہ رفتہ یہ وجوہ (اور یہاں معاشی وجوہ ہی کی جانب اشارہ کافی نہیں ہے بلکہ تہذیبی اور سیاسی اسباب بھی پیش نظر ہیں) وہ ہندی نویسی کی جانب مائل ہوتے گئے۔

حتیٰ کہ آخری دور کے بیشتر افسانے اور ناول انھوں نے پہلے ہندی میں قلمبند کئے پھر ان کا ترجمہ خود کیا یا اقبال ورما سحر صاحب سے کرایا۔" بیسویں صدی کی ابتدا میں وہ ہندو قومیت اور لسانی جذبات میں اتنے بہہ گئے تھے کہ ان کا وہ جذبہ جس کے تحت انھوں نے اردو میں افسانہ نویسی شروع کی تھی ہندو لسانی کی آتش میں جل کر خاک ہو چکا تھا۔ اس کا مظہر ان کا وہ خط ہے جو انھوں نے لبتی سے ایڈیٹر زمانہ منشی دیا نرائن نگم کو ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا۔" پریم پچیسی کے ہندی ترجمے کے لئے کئی جگہ سے اصرار ہوا ہے۔ میں نے خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں اردو میں اب گذر نہیں معلوم ہوتا ہے کہ منشی بال مکند مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں اپنی زندگی صرف کر دوں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا۔

(زمانہ" پریم چند نمبر ص ۱۰۸)

مندرجہ بالا خط سے کئی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ (۱) ابتداء میں منشی جی معمولی ہندی جانتے تھے۔ انھیں ہندی رسم خط کی مشق نہ تھی۔ دوم یہ کہ منشی جی۔ اردو کے ادیب تھے اور اس وقت کی ہندی اردو کی لسانی تحریک سے وہ متاثر ہو کر اردو ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ (۳) وہ ہندی تحریک کو ہندو قوم کے لئے بے حد مفید سمجھتے تھے۔

یہ تھے وہ اثرات جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی

ابتدا میں ہوئے (انگریزی پالیسی کے طفیل ہندی نوازی کی) بام عروج پر پہونچ چکا تھا اس جذباتی طوفانی دھارے میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو ثابت قدم رہ سکے۔ اور اسی جذبہ میں پریم چند نے اپنے دوسرے خط میں لکھا۔

"ہندوستان کے ایک صوبہ میں مسلمانوں کی بہت سنکھیا موجود ہے سینکیت پرانت کے سوا اور صوبوں میں مسلمانوں نے اپنے اپنے صوبوں کی بھاشا اپنالی ہے۔ بنگال کا مسلمان بنگلہ بولتا ہے اور لکھتا ہے۔ گجرات کا گجراتی، میسور کا کنٹری، مدراس کا تامل اور پنجاب کا پنجابی، یہاں تک کہ اس نے اپنے صوبہ کی لپی گرھن کرلی ہے اردو لپی اور بھاشا سے یدپی اس کا دھارمک اور سنسکرت انوراگ ہو سکتا ہے۔ لیکن تیبر پرتی کی جیون میں اسے اردو کی بالکل آوشکتا نہیں پڑتی۔ یہ دوسرے صوبوں کے مسلمان اپنے صوبہ کی بھاشا میں نام کو بھی کوئی بھید نہیں رہ جاتا تو پھر جو سینکت پرانت اور پنجاب کے مسلمان کیوں ہندی سے اتنی گھرنا کرتے ہیں۔ ہمارے صوبے کے دیہاتوں میں رہنے والے مسلمان اپنے پراوسی دیہاتوں کی بھاشا بولتے ہیں۔ بول چال کی ہندی اور اردو پرایے ایک ہی ہے۔" (پریم چند کے کچھ وچار بنارس ۱۹۳۶ء ص ۱۶۸)

بحوالہ بھاشا اور سماج ص ۲۰۵ مندرجہ بالا خط پر جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تصنیف لسانی مطالعے میں خوب تبصرہ فرمایا ہے۔ اور آبادی کے گوشوارے سے منشی پریم چند جی کی اس بات کی تردید کی ہے کہ ہندوستان کے غیر ہندی صوبوں کے مسلمانوں میں بھی کافی مسلمانوں نے اردو کو اپنی زبان لکھایا ہے لیکن پنجاب اور ہندی صوبوں کے علاوہ کسی اور دوسرے صوبوں میں ہندی کو اپنی مادری زبان بہت کم لوگوں نے لکھا ہے۔ خیر یہ تو ایک الگ سوال ہے اور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انگریز مصنفین نے ہندوستانی زبانوں

کے بولنے والوں کے جو آنکڑے تحقیق و تصدیق کے بعد دیئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں اردو کتنی مقبول تھی اور جدید ہندی کھڑی بولی بولنے والوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اور اس احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے جدید ہندی کے بانیوں نے برج بھاشا اور اودھی، بھوجپوری میتھلی راجستھانی سبکو ہندی میں شامل کر لیا تھا اور اس وقت کے اردو داں طبقہ نے اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ انھوں نے قدیم اردو کو اپنی پرانی روش کے تحت قابل اعتنا نہ سمجھا بلکہ انہ فارسی شعرا کی طرح ہندی کے شعرا (قدیم اردو) کے شعرا کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد کے اردو شعراء ادیبوں نے بھی اسی روش کو برقرار رکھا۔ قدیم اردو کے پانچ سو سے زیادہ مسلمان شعراء کو اپنے زمرے میں شامل نہیں کیا۔ ابتدا میں جتنے اردو شعرا کے تذکرے لکھے گئے ان میں خسرو اور ولی کے سوا زیادہ تر دہلی اور لکھنؤ کے شعراء تھے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوسرے فارسی زدہ شعراء کو ہی شامل کیا گیا ہے۔ نظیر اکبرآبادی جیسے عوامی شاعر تک کو نظرانداز کر دیا گیا۔ یہ بہت بڑی بھول تھی، کیونکہ برج بھاشا، اودھی، ہریانی، پنجابی زبانوں سے اردو کی تخلیق میں اہم رول ادا کیا ہے اور ان کی وہ شاعری جس میں فارسی عربی اور ترکی الفاظ کم ہیں قدیم اردو کہلانے کی مستحق ہے۔ ان کی نظراندازی نے اردو کو زبردست نقصان پہونچایا۔ وہ تو یوں کہیے کہ حیدرآباد دکن کی اردو سرپرستی نے دکنی ادب کو اردو میں شامل کیا نہیں تو شمالی ہندوستان کے قدیم اردو کے شعراء کی طرح اس کو بھی اردو میں شامل نہیں کیا جاتا کیونکہ ان کی زبان بھی برج بھاشا اور پنجابی بولی سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔ ان قدیم اردو

کی بولیوں سے جو اپنی الگ انفرادیت بھی رکھتی ہیں ان سے کھڑی بولی اردو اور کھڑی بولی ہندی کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا اس لئے جدید ہندی کے بانیوں نے انھیں اپنا لیا۔
مذہبی جذبہ نے انھیں اور بھی جدید ہندی کی جانب مائل کیا اور ہندی نام کی ہندو نام سے مناسبت نے، اس جذبہ کو ابھارا دی جس کی مثال منشی پریم چند جی کے خطوط سے دے چکا ہوں۔ ان کا ایک اور اقتباس جو مجھے ایک ناگری ہندی کتاب کے مطالعے سے دستیاب ہوا اس سے ہم آہنگ بانی منشی پریم چند جی کے دلی جذبات کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر ہندی نوازی کا اثر ہندی نام کی ملک و قوم کی مناسبت سے اور اردو نام کی اس کے جنیت کی بناء پر ہوا۔ کیونکہ ہر شخص کے قومی جذبات اس بات کو چاہتے ہیں کہ جس چیز میں اسے اپنایت نظر آئے وہ اسے اپنائے۔ اس جذبہ کے تحت منشی پریم چند جی مجبور ہو گئے تھے کیونکہ منشی جی نے جہاں ہندوستان کے دیہات کی حالات کو عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہاں انھوں نے ہندو قوم کے تاریخی و تہذیبی اور رزمیہ پہلوؤں کو شرر لکھنوی، صادق حسین صدیقی، نسیم حجازی کی طرح ابھارا تھا اس سے ان کا مقصد ہندو قوم کے احساس کمتری کو دور کرنا اور دلیرانہ جذبات کو بالا کرنا تھا اور ہندو قوم میں ایک نئی روح پھونکنا تھا۔ ہاں اگر اردو کا نام اس وقت ہندی یا ہندوستانی یا بھارتی ہوتا تو وہ کسی حالت میں بھی ہندی کی موافقت نہیں کرتے وہی نہیں بلکہ سینکڑوں اردو کے مصنفین ہم سے جدا نہ ہوتے۔ جس بات کو میں نے اب محسوس کیا۔ منشی پریم چند نے اس وقت محسوس کر لیا تھا۔ یہ بات ان کی اس اپیل سے ظاہر ہو جاتی ہے جو انھوں نے اردو والوں سے کی ہے۔ جس کی نقل میں ڈاکٹر کمل بہاری سنگھ کی مشہور کتاب

"مسلمانوں کی ہندی سیوا" کے دیباچہ میں ۸ سے پیش کر رہا ہوں۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمان دوستوں سے مجھے کچھ عرض کرنے کا حق ہے کیوں کہ میری ساری زندگی اردو کی خدمت کرتے گزر رہی ہے۔ اور آج بھی میں جتنی اردو لکھتا ہوں اتنی ہندی نہیں لکھتا۔ کائستھ ہونے اور عالم طفلی میں فارسی کی مشق کرنے کے سبب اردو جتنی میرے لئے مناسب ہے اتنی ہندی نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں آپ ہندی کو کیوں گردن زدنی سمجھتے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے اور نہیں ہے تو ہونا چاہیئے کہ ہندی کا پہلا شاعر جسنے ہندی کا ادبی بیج بو یا (روحی تخم بیشتر پڑ چکا تھا) وہ امیر خسرو تھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ اکبر جہانگیر شاہجہاں اور اورنگزیب تک ہندی شاعری کا شوق رکھتے تھے اور اورنگ زیب نے ہی آموں کے نام "رسنا ولاس" اور "سدھارس" رکھے تھے۔ کیا آپ کو معلوم معلوم ہے کہ ہندی میں ہزاروں الفاظ ہزاروں قول عربی اور فارسی سے آئے ہیں اور سسرال میں آکر گھر والے بن گئے۔ اگر یہ معلوم ہونے پر بھی آپ ہندی کو اردو سے الگ سمجھتے ہیں تو آپ ملک کے ساتھ اور اپنے ساتھ بے انصافی کرتے ہیں۔ "اردو" لفظ کب اور کہاں پیدا ہوا اس کی کوئی تاریخی سند نہیں ملتی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں وہ بڑا خراب آدمی ہے اور وہ درجن متوشیہ ہے دو الگ زبانیں ہیں۔ ہندو کو خراب بھی اچھا لگتا اور "بد آدمی" تو اپنا بھائی ہی ہے۔ پھر مسلمانوں کو درجن کیوں برا لگا اور متوشیہ کیوں دشمن سا نظر آئے۔ ہماری

قومی زبان پھلے بڑھے، عمدہ اور خراب دونوں کے لئے جگہ ہے
وہاں تک جہاں تک اس کی واقفیت میں رکاوٹ نہیں آتی
اس سے آگے ہم اردو کے دوست ہیں اور نہ ہندی کے۔ مزا یہ
ہے کہ ہندی مسلمانوں کی کا دیا ہوا نام ہے اور بچاس سال پہلے
تک جسے آج اردو کہا جاتا ہے اسے مسلمان ہندی کہتے تھے۔
اور آج ہندی مردود ہے۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ ہندی
ایک قدرتی نام ہے۔ انگلینڈ والے انگلش بولتے ہیں۔ فرانس
والے فرنچ، جرمنی والے جرمن، فارس والے فارسی، ترکستان
والے ترکی، عرب والے عربی، پھر ہند والے کیوں ہندی نہ
بولیں۔ اردو نہ قافیہ میں آتی ہے نہ ردیف میں۔ نہ بحر میں نہ
وزن میں۔ ہاں ہندوستان کا نام اردوستان رکھا جائے تو
یہاں کی قومی زبان اردو ہوگی۔ قومی زبان کے پجاری ناموں
سے بحث نہیں کرتے وہ تو اصلیت سے بحث کرتے ہیں۔"

(مسلمانوں کی ہندی سیوا۔ ص ۔ ۸)

مجھے اس اقتباس کی کئی باتوں سے اختلاف ہے۔ کیا منشی پریم چند جی
کا جو لباس ان کے فوٹو میں نظر آتا ہے اور اس وقت اس لباس کے پہننے کا رواج
عام تھا۔ اس کو چھوڑ کر دو ہزار سال پہلے کا اشوک اور گپتا کے زمانے کا لباس
اپنی روزمرہ کی زندگی میں زیب تن کر سکتے تھے۔ آج بھی اگر کوئی دفتر میں منشی
جی والا لباس پہن کر چلا جائے تو لوگ اسے دقیانوسی آدمی سمجھیں گے اور
مذاق اڑائیں گے۔ یہی حال "خراب آدمی کا دور اور درجن منوشیہ" کا ہے
ایک کا رواج عام ہو چکا ہے۔ برسوں سے عوام اور خاص کی زبانوں پر چڑھ

چکا ہے۔ زبانوں کی خاصیت ہے کہ وہ آگے کی جانب بڑھتی ہیں پیچھے کی جانب نہیں
واپس لوٹتیں ۔ آج گو کہ ہندی قومی زبان ہے اور کروڑوں روپیہ اس کی
ترقی اور اس کو سنسکرت نما بنانے میں خرچ ہو رہا ہے لیکن یہ کوششیں کامیاب
نہیں ہو رہی ہیں بلکہ بول چال کی زبان شہر تو شہر دیہات کی بھی اردو ہوتی جا
رہی ہے۔ کوٹ، پتلون، بشرٹ، بستر، ممی، پاپا، ڈیڈی، میز، کرسی وغیرہ
ہزاروں ودیشی لفظوں نے خواص و عوام کی زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ آج
قصبوں سے لے کر بازاروں میں سائن بورڈ تک ودیشی زبان انگریزی میں
ملیں گے۔ کارخانوں سے تیار شدہ مال تک کے نام انگریزی زبان میں ہی لوگ رکھتے
ہیں۔ کیونکہ اردو زبان ملی جلی زبان کا ہی نام ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ
اردو ترقی کر رہی ہے اور مقبول ہو رہی ہے۔ کوئی زبان پیچھے کی جانب نہیں لوٹتی
جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلط سوچتے ہیں۔ منشی پریم چند کے زمانے میں بھی اور آج
بھی ارباب ادب نے انگریزوں کی منافرانہ پالیسی کی جانب بہت کم دھیان دیا اگر
وہ اس کو سمجھ پاتے تو یہ مسئلہ اتنا طول نہ پکڑتا۔ انگریزوں کی اسی پالیسی کے کیا کیا
نتائج ہوئے۔ کس طرح ہندوستانیوں کو گمراہ کیا گیا۔ ہندوؤں کی ہندی کی موافقت اور
اردو کی مخالفت نے مسلمانوں کو بھی اردو کی طرفداری پر مجبور کر دیا۔ لطف یہ کہ
وہ کھل کر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صرف تنہا ان کی زبان ہے۔ ہندوستان
کا مسلمان عربی کو تو مذہبی بنا پر اپنی زبان کہہ سکتا ہے لیکن اردو کو نہیں کہہ سکتا کہ
یہ تنہا اس کی زبان ہے کسی قوم کے تمام افراد ایک نسل ایک زبان اور ایک مذہب کے ہوں
تو قومی ہم آہنگی بہت مضبوط ہو جاتی ہے لیکن اگر قوم کئی نسلوں زبانوں اور مذہب میں بٹی ہو
تو رشتۂ اتحاد ضعیف ہوتا ہے۔ مذہب زبان اور نسل کی وفاداری زبان قومی وفاداری سے ٹکراتی
ہیں اور قومی وحدت کو مجروح کرتی ہیں۔ ہندوستان ایسا ہی ملک ہے جس میں کئی نسلیں زبانوں اور مذاہب

ہیں۔ ان کے جذبات کو تخریبی اور تعمیری دونوں پہلوؤں کی جانب موڑا جا سکتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی ان کمزوریوں کو سمجھا اور مذہبی جذبات بھی مجروح کرنے کے لئے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں منافرت پیدا کر دی۔ لسانی جذبات کو متحد رکھنے والی ایک زبان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو مسلمان اور دوسری کو ہندو بنا کر ایک نفرت کی بڑی خلیج دونوں قوموں کے درمیان بنا دی جس کا پاٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔ انگریز کی اس منافرت انگیز لسانی پالیسی کے مستقبل میں جا کر اتنے نتائج ہوں گے اس کا تصور شاید انگریز کو بھی نہ تھا۔ اسی لسانی منافرت کی وجہ سے ملک دو حصوں میں اور پھر تین حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اسی لسانی منافرت کی وجہ سے ہی اردو جاننے والے بہاریوں کی جو ابتر اور سقیم حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، نہ انھیں بنگلہ دیش رکھنے کو تیار ہے نہ پاکستان جس کے لئے انھوں نے اپنے گھر بار کو قربان کیا تھا اور نہ ہندوستان جہاں ان کے باپ دادا پیدا ہوئے تھے۔ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اردو بولتے ہیں اور اسے مادری زبان تصور کرتے ہیں۔ میں اردو ہندی کے مسئلہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔ نہ یہ میرا موضوع ہے۔ یہاں تو مجھے صرف اتنا ظاہر کرنا ہے کہ زبان کی لسانی تقسیم اور اس کے جدید ناموں کے قوم و ملک پر کیا اثرات ہوئے۔ ایک نام کی ایک فرقہ اور ملک سے مطابقت نے اس فرقہ کو اس جدید زبان سے کس حد تک جذباتی لگاؤ پیدا کر دیا جس کی بنا پر یہ اردو زبان کے اچھے اچھے اسکالروں نے اس سے اجتناب برتا۔ ۱۸۵۸ء سے شروع بیسویں صدی تک جدید ہندی کے جتنے بھی خواہ تھے وہ سب اردو فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ چاہے وہ راجہ لچھمن سنگھ ہوں یا راجہ شوپرشاد یا بھارتندو ہریش چندر یا رام رام چندر شکل یا شیام سندرداس، بابو ایودھیا پرشاد کھتری سب ہی ہندی

کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو میں کافی لیاقت رکھتے تھے۔ لیکن ہندی نام کے لسانی اور قومی جذبات نے انھیں اردو کی مخالفت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح بہت سے اردو کے ادیبوں نے ہندو مسلم یکجہتی کے دھارے کو چھوڑ کر اپنے قومی لسانی جذبات کے دھارے میں بہنا شروع کر دیا۔ پریم چند کی مثال میں پچھلے اوراق میں پیش کر چکا ہوں اور دسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں صرف ایک مثال اور پیش کروں گا جس سے ثابت ہو جائے گا کہ ہندو قوم سے ہندی نام نے کس حد تک اس زبان کے بہت سے ہندو ادیبوں میں جذباتی اور دینی طور پر لگاؤ پیدا کر دیا تھا۔ جناب شیام موہن لال جگر بریلوی کے اسم گرامی سے کون اردو داں واقف نہیں ہے۔ ان کی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت گزاری میں گزری ہے اور آپ کا انتقال پچھلے سال ہی ہوا ہے اور اس سے اردو کو ناقابل فراموش نقصان پہنچا ہے۔ مرحوم بے حد خوبیوں کے مالک تھے۔ اردو کے بہی خواہ اور محسن بھی تھے۔ اردو میں بہت سی کتابوں کے خالق تھے ان کی مثنوی "پیام ساوتری" کا شمار اردو کی مشہور ترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اور اردو کے ایم۔ اے۔ اے کے کورس میں داخل ہے اور کئی بیرونی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ وہ بھی ایک بار ۱۹۳۱ء میں اردو ہندی قضیے سے متاثر ہو کر ہندو قوم پرستی میں بہہ گئے تھے اور ہندی کی موافقت اور اردو کی مخالفت میں انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ جس کا نام انھوں نے "اردو اور ہندو" رکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی ملکی افراتفری میں وہ کتاب گم بھی ہو گئی تھی تو انھوں نے اسے دوبارہ ترتیب دیا لیکن ملک کی آزادی کے بعد جب آپ کا مقام اردو داں حلقوں میں بہت بلند ہو گیا اور اس کتاب کی اشاعت ان کی اس ادبی پوزیشن کو متاثر کرتی ہوئی معلوم ہوئی تو آپ نے اس کو شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن

اتفاق سے وہ مسودہ ان کے ایک ہندی کے کٹر ہندی کے حامی شاگرد کے ہاتھوں میں پڑ گیا جس نے اس مسودہ کو کتر بونت کر کے ۱۹۷۰ء میں شائع کر دیا۔ میں نے اس کا ایک قلمی مخطوطہ بھی دیکھا جو سورگیہ شیام موہن لال جگر مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور آجکل میرے عزیز دوست ویریندر پرشاد سکسینہ کے قبضہ میں ہے۔ بہرحال ۱۹۷۰ء میں جب کیپٹن سوریہ پرتاپ (جگر صاحب کے شاگرد کا نام) نے یہ کتاب شائع کی۔ تمام اردو داں حلقوں میں ہل چل سی مچ گئی اور خود جگر صاحب جن کی عمر اس وقت ۸۰ برس سے زائد تھی کو اپنی ادبی پوزیشن کے تحت سخت صدمہ ہوا اور انھوں نے اس کتاب سے لاتعلقی ظاہر کی۔ اور کتاب شائع کرنے والے کیپٹن سوریہ پرتاپ حق پرست صاحب کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا جس کی نقل میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ کتاب اور اس میں نستی جگر صاحب کا قلمی خط بھی مجھے بابو ویریندر پرشاد سکسینہ کی لائبریری میں دیکھنے کو ملا۔

(کچی نقل)

میرٹھ، ۲ مارچ

مکرمی تسلیم۔

گرامی نامہ معہ جملہ کاغذات کے ملا۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ سال ڈیڑھ سال تک آپ خاموش رہے۔ میرے دو خط بھی اس درمیان میں بے جواب رہے۔ اگر مجھے خواب میں بھی یہ خیال آجاتا کہ آپ کیا کر رہے ہیں تو میں آپ کو ان تمام مصارف و زحمت سے بچا لیتا جو آپ کو اٹھانا پڑی۔ پھر یہ رسالہ جس کا نام آپ نے بجائے "اردو اور ہندو نہ کے اردو پر ایک تحقیقاتی نظر رکھتا ہے" ام ء میں لکھا تھا۔ اس وقت ان حالات کے عین مطابق تھا۔ اگر شائع ہو جاتا۔ اب انیس سال بعد حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ وہ دور غلامی کا تھا۔ اردو اسکولوں دفتروں اور تمام

سرکاری اداروں میں رائج تھی۔ اب سوراجیہ ہے۔ اس وقت اردو کسی ریاست میں نہیں رائج ہے۔ ہندو قوم نے اسے بالکل فراموش کر دیا ہے۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں دو چار چند واسے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شوقیہ طور پر تو اسے عام ہندو جماعت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ رہے مسلمان وہ کبھی اسے ترک نہیں کریں گے۔ ہماری سرکار نے بھی اس کو کوئی جگہ نظام حکومت میں نہیں دی ہے۔ مسلمانوں پر ہندی پڑھنا لازمی ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ مسلمان اردو کو بھی قائم رکھیں گے۔ ان حقائق کے پیش نظر میرا فیصلہ قائم ہے کہ آپ براہ نوازش وکرم ہرگز اس کتاب کی اشاعت نہ فرمائیں جس کو آپ اردو زبان پر ایک تحقیقاتی نظر نام دیا ہے۔ مجھے اس کتاب کی اشاعت سے سخت تکلیف پہونچی ہے۔ نیاز کیش

(دستخط جگر بریلوی)

یہ کتاب کیسی ہے اور اس میں اردو کے خلاف کیسا کیسا زہریلہ اور بے بنیاد مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ تو اس کتاب کے پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے دیباچہ میں سے جو خود سورگیہ حضرت جگر بریلوی نے تحریر فرمایا تھا۔ کچھ اقتباس پیش خدمت ہیں۔

" مجھے بھی بچپن سے اردو سے شوق ہو۔ مدت العمر اس شوق میں گذارنے کے بعد اردو کی ان مخفی قوتوں سے آگاہ ہو سکا ہوں جو ہندوؤں کے حق میں زہر ثابت ہو رہی ہیں۔ اس آگاہی سے پہلے بہت سی تصنیفات اردو میں لکھ چکا تھا اور اب میرے لئے اردو میں تصنیف وتالیف کے شوق کو ترک کر دینا ایسا ہی تھا جیسے دریا کو الٹا بہانے کی کوشش کرنا یہ اس سوال کا جواب ہے جو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد پیدا ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ جب اردو ہندوؤں کے لئے اتنی مضرت رساں زبان ہے تو میں اپنی تمام عمر اس میں کیوں برباد

کی۔

(اس ۱۹۷۱ء میں جگر بریلوی، اردو پہ ایک تحقیقاتی نظر)

علامہ جگر بریلوی کی شخصیت اردو ادب میں ایک مسلمہ حیثیت رکھتی تھی وہ اردو زبان کے مستند اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ان کی اردو خدمات اور ادبی شخصیت اثر انداز ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس کتاب کو جو ان کی بغیر اجازت شائع کی گئی تھی۔ ہماری زبان کے شمارے ۸ جون ۱۹۷۰ء میں اظہار حقیقت کے عنوان سے ایک مضمون شائع کر دیا جس میں انھوں نے اپنی اس جذباتی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے صاف لکھا۔

"مجھے رسالہ پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ اس سے میری اردو دشمنی کا ثبوت دیا گیا ہے یہ رسالہ ایک سیلانی رو میں لکھا گیا جو آئی اور نکل گئی اور جسے تیس سال یعنی ایک جگ ہو گیا ہے۔ یہ بعد کا زمانہ میری اردو کی خدمات سے روشن ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں کیپٹن سور یہ پرتاپ صاحب حق پرست نے بہت نے بہت قطع و برید کی ہے جس کا اعتراف انہوں نے دیباچہ میں کیا ہے۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعہ مجھے اعلان کرنا لازمی ہو گیا کہ اس رسالہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

(جگر بریلوی ۵ رمئی ۱۹۷۰ء)

اس کے بعد ان پر سے فرقہ پرستی کا الزام ختم ہو جاتا ہے لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک قوم سے مطابقت رکھنے والے نام کا اثر اس قوم سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ فرد مصنف اور شاعر کے دل و دماغ میں جب لسانی جذباتی اور قومی خیالات کو ابھار دیتا ہے تو وہ لسانی اعتدال اور انصاف کی ڈگر کو ترک کر

دیتا ہے وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس زبان کے جس نے مجھے پرورش کیا ہے اور تہذیبی زندگی بخشی ہے مجھ پر کیا حقوق ہیں۔ آنجہانی جگر صاحب بھی اردو کے ایک مشہور ادیب اور شاعر نہ ہوکر اگر ناول نویس یا افسانہ نگار ہوتے تو وہ بھی منشی پریم چند اور کئی دوسرے نثر نگاروں کی طرح اپنے قومی لسانی جذبات میں بہہ کر ہندی ہندو کے نام کے جادو سے ہندی کے بھی خواہ اور ہندی مصنف بن جاتے لیکن ان میں اور منشی پریم چند کی ادبی حیثیت میں فرق تھا۔ پریم چند ناول نویس اور افسانہ نگار تھے اور اس لئے معمولی سی کوشش سے دو لسانی مصنف بن بیٹھے لیکن مرحوم جگر صاحب تنہا اردو کے شاعر اور ادیب تھے۔

انگریزی کی منافرانہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" والی ڈپلومیسی کا اثر مجتبا دیبوں شاعروں اور ادب نواز حلقوں پر ہوا اس پر مختصری روشنی مندرجہ بالا سطور میں ڈال چکا ہوں اور سیاسی طور پر زیادہ روشنی ڈالنے کے لئے اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز مورخین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے اس ملک میں فرقہ وارانہ مذہبی اور لسانی منافرت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ بیج انگریزوں کا ہی بویا ہوا ہے! انھوں نے اس کی جڑیں اتنی مضبوط کر دیں کہ آج تک کوئی اس کی بیخ کنی نہ کر سکا۔ انگریزوں نے روز اول ہی سے لڑاؤ اور حکومت کرو کے خطرناک گر کو استعمال

؎ دوسرے مصنفین کو چھوڑیے۔ ڈاکٹر سنیتی پرشاد چٹرجی ماہر لسانیات بھی ہندی ہندو کے زہریلے پروپیگنڈے سے نہ بچ سکے اور وہ بھی چندر بلی پانڈے جیسے متعصب مصنفین کی جھوٹی سچی باتوں سے کافی متاثر نظر آتے ہیں اور انھیں تاثرات کے تحت اس زبان کے لئے ہندو ہندی اور مسلمانی اردو کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہند آریائی اور ہندی بحوالہ صدیہ اردو سے ہندی تک از ڈاکٹر عبدالودود

کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ پلاسی سے ۱۹۴۷ء تک وہ اس پر کاربند رہے۔

ہندوستانیوں میں یہ زہر اتنا شدید طور پر بھر دیا گیا تھا کہ بیسویں صدی میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت کی جدوجہد زور شور سے شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی ہر فرقہ فرقہ وارانہ انداز سے سوچنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ کانگریس جو ملک کی سب سے بڑی اور واحد سیاسی پارٹی تھی۔ یکجہتی اور سیکولرزم کی نمائندہ تھی اس کے بھی بہت کم افراد ان تاثرات سے خالی تھے۔ قوم پرست اور فرقہ پرست افراد اور لیڈر ان میں امتیاز کرنا بے حد مشکل تھا۔ ڈاکٹر بپن چندر اپنے ایک مضمون قومی یکجہتی اور سیکولرزم میں رقمطراز ہیں۔

"قوم پرست اور فرقہ پرست لیڈروں میں قابلِ لحاظ فرق یہ ہے کہ قوم پرست مختلف فرقوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کر کے انھیں سامراجیت سے برسرپیکار کرنے کے لئے متحد کرنا چاہتے تھے جبکہ فرقہ پرست آپسی بھید بھاؤ اور مناقشوں کو ہوا دیتے تھے۔ گویا دونوں نے فرقہ داریت کی منطق کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ البتہ پہلا گروہ سب کو سطحی مصالحتوں اور بالائی سمجھوتوں کے ذریعہ متحد کرنا چاہتا تھا اور دوسرا انھیں مزید الگ کرنے پر مصر تھا اس طرح سیاست میں مستقل طور پر فرقہ واریت سرایت کر گئی اس صورت حال نے چند ذیلی نتائج کو جنم دیا۔ مثلاً فرقہ پرست لیڈروں کے لئے یہ ایک آسان طریقہ نکل آیا کہ اتحاد قومی کے نام پر کانگریس کی صفوں میں شامل ہو جائیں اور ہندو مفادات کی حمایت میں اس سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ چنانچہ ایک انتہائی سیکولر سمجھا جانے والا کانگریسی بھی پلک جھپکنے میں انتہا درجہ کا فرقہ پرست بن جاتا تھا

اور اس پر کسی کو حیرت نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہی لیڈر پھر سیکولر
اور اتحاد قومی کی باتیں کرتا بھی نظر آتا۔" رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"
اوپری سطح سے اتحاد کی حکمت عملی نے ایک بھاری نقصان پہنچایا کہ ہندو
مسلم اتحاد کی باتیں کرتے کرتے سیاسی لیڈر دیدا گانہ فرقہ داری وجود
کے احساس کا شکار ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ فرقہ پرست لیڈروں نے
کانگریس سے قطع تعلق کر کے کانگریس ہی کو نشانۂ ملامت بنایا۔ پھر بھی
انھیں دوبارہ کانگریس میں داخل کر لیا گیا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے
سامنے ہیں۔ پنڈت مدن موہن مالوی کبھی ہندو مہا سبھا تو کبھی کانگریس
کی نمائندگی کرتے نظر آتے۔ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے دوسری گول میز
کانفرنس کے موقع پر ہندو فرقہ واریت کی علمبرداری کی۔ لیکن
۱۹۳۲ء میں انھیں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت سونپی
گئی۔ پنجاب میں گوپی چند بھارگو ایک دن صوبائی اسمبلی میں ہندو
فرقے کے نمائندے بن کر آئے تو دوسرے دن ان کی حیثیت کانگریس
اور گاندھیائی لیڈر کی تھی۔ اس طرح زیادہ تر کانگریسی لیڈر
ملازمتوں کے حصول نیز دستوری مباحثے کے وقت فرقہ وارانہ
فسادات یا زبان کے مسئلہ پر بولتے ہوئے ہندو کاز اور ہندی
زبان کی وکالت کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں کانگریس کے
گوہاٹی اجلاس میں موتی لال نہرو نے اپنی قوم پرور فرقہ پرست
نقادوں کا ذکر کرتے ہوئے سوراجیوں کی شکست کی وجہ ان
کی سچی قوم پرستی کو بتلایا اور فرقہ پرستوں کی بے ایمانی اور دہشت پسندی
کو نشانۂ ملامت بنایا۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں نے دیکھا کہ جلد ہی

موتی لال نہرو اپنے فرقہ پرست ناقدین کے ہمراہ شانہ بشانہ جنگ آزادی لڑ رہے ہیں۔ یہاں اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شدھی سنگھٹن جیسی تحریکوں کی قیادت بھی چوٹی کے کانگریسی اور دیگر قوم پرست لیڈروں ہی نے کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ پرستانہ خیالات کانگریس کی صفوں میں کافی گہری جڑیں پکڑ چکے تھے۔ حتیٰ کہ صفِ اول کے کانگریسی لیڈروں میں کئی کم و بیش اس مرض کا شکار رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ایسی شخصیتوں اور اخباروں کی دورخی پالیسی کو سمجھنا مشکل ہو گیا۔ بلکہ خالص قوم پرستی اور ہندو پرستی کے درمیان ڈولتی ذہنیت نے مسلمانوں کے اس شک کو یقین میں بدل دیا کہ اکثریت والے منافقت پر آمادہ ہیں۔" (ص ۱۸۷ — ۱۸۸)

(شاعر کا تہمی یکسہ جہتی نمبر، ڈاکٹر بپن چندر۔ ترجمہ یونس لگا سکر)

ان حالات میں کانگریس میں شامل شدہ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ معاملات میں خاموشی اور پہلو بچانے کی پالیسی سے ان لوگوں کی پوزیشن ایک شوبوائے کی سی ہو گئی۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم وغیرہ جیسے مستند قوم پرست شامل تھے اور بہت سے مسلم لیڈر ان جیسے مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، ظفر علی خاں، محمد علی جناح اور بہت سے چوٹی کے مسلمان لیڈر جنھوں نے ۱۹۳۰ء تک کانگریس کی آزادی کی لڑائی میں برابر حصہ لیا تھا۔ کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلم فرقہ پرست تنظیم میں شامل ہو گئے۔ اس بات کو سر سید احمد خاں نے بنارس میں انیس ویں صدی ہی میں محسوس کیا تھا اور انھوں نے کانگریس بلکہ سیاست ہی سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی تھی اور بلکہ دوسرے

مسلمانوں کے لئے بھی یہی راستہ بہتر سمجھتے تھے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو جسے انگریز نے غدر کا نام دیا تھا اس کے لئے مسلم قوم ہی قصور وار سمجھی گئی تھی۔ اور اس کو ہی اصل ملزم قرار دیا گیا تھا۔ اس کا بدلہ انگریز نے ہندو اکثریت کی سرپرستی اور اس کے فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر لیا۔ اور یہ سرپرستی بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک رہی۔ اس دوران میں سیاسی تہذیبی اور ثقافتی طور پر مسلمانوں کو نقصانات پہنچانے کی روش جو اس نے ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی لڑائی سے ہی شروع کی جاتی اور تیز کردی گئی تھی۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی کے مقام پر انگریزوں کو سرکاری زبان بنا دیا گیا اور صوبائی زبانوں کو ابھارا گیا۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو کو تقسیم کر کے ایک نئی زبان بنائی گئی جس کا نام ہندی رکھا گیا اور اسے ہندوؤں کے سپرد کر دیا گیا اور یکجہتی کی شاہکار اردو کو مسلمانوں کی زبان بتایا گیا یہ سب میں پچھلے صفحات میں تحریر کر چکا ہوں ۱۸۶۷ء میں بہار سے اردو کو نکال کر ہندی کو دفتری اور سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں مدھیہ پردیش میں ہندی کو لازمی قرار دیا گیا اور ۱۸۹۸ء میں یہ عمل اتر پردیش میں بھی دوہرایا گیا اور اردو کے ساتھ ہندی کو سرکاری اور دفتری زبان بنا دیا۔ برادران وطن انگریز کے منافرانہ سیاست کو نہ سمجھ سکے اور ان کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے۔ اس سلسلے میں میں ملک کی سب سے بڑی پارٹی کانگریس کے لیڈران کا رول میں ڈاکٹر بین کے الفاظ اوپر تحریر کر چکا ہوں۔ اسی ذہنیت کو ڈاکٹر موصوف اور واضح الفاظ میں تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" قوم پرست اخبارات کا رویہ بھی اس سے مستغنی نہ تھا۔ ان میں اکثر پورے وقت قوم پرست بنے رہتے تھے اور وقتی مشغلے کے طور پر فرقہ پرستی کا پرچار کرتے۔ مثلاً لاہور کی ٹریبون جو ایک نیشلسٹ اخبار کہلاتا تھا سرکاری ملازمتوں، صوبائی اسمبلیوں میں ہندوؤں کے لئے زیادہ نشستوں

کے تحفظ کے لئے آواز اٹھاتا رہتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران
اس اخبار نے ہمیشہ ہندوؤں کی طرف داری کی الٰہ آباد سے نکلنے والا
"لیڈر" اور کلکتہ کے امرت بازار پتریکا کا رویہ بھی اس سے مختلف
نہ تھا حد تو یہ ہے کہ ہندوستان ٹائمز جیسا اخبار بھی مہاتما گاندھی اور
جی ڈی برلا سے وابستگی کے باوجود ہندو مہا سبھا سے منہ موڑنے پر
آمادہ نہ تھا۔ یہ حقیقت مدنظر رہے کہ مدن موہن مالویہ، این سی
کیلکر اور ۱۹۳۱ء کے بعد لالہ لاجپت رائے ہی فرقہ پرستی کے علمبردار
نہ تھے بلکہ فرقہ پرستانہ خیالات کانگریس کی صفوں میں کافی گہری جڑیں
پکڑ چکے تھے۔ حتیٰ کہ صف اوّل کے کانگریسی لیڈروں میں کم و بیش اس
مرض کا شکار تھے۔ ان میں سے کچھ مثلاً کے۔ ایم منشی جب ۱۹۳۷ء
میں صوبوں کی وزارتوں میں شامل ہوئے خاصے تباہ کن ثابت ہوئے
اس طرح ۱۹۴۷ء میں سردار پٹیل کا جو کردار رہا وہ بھی کوئی ایک دو
روز کا قصہ یا وقتی تاثر نہ تھا بلکہ ان کی ذہنی نشوونما میں ہندوستان
کی تاریخ سے متعلق ان کے فرقہ وارانہ رجحان کا بڑا ہاتھ تھا۔ سچ تو یہ
ہے کہ کانگریسی قوم پرست لیڈروں کے قوم پرست لیڈروں سے
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق مخصوص نظریات ہی
ان کی فرقہ پرستی کا کھلا ثبوت ہے۔ یہ لیڈر اکثر اپنی تقریروں اور
تحریروں میں اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہندوستان ایک ہزار
سال تک غیر ملکی طاقتوں کا غلام رہا ہے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کا دورِ حکومت
ہندو تہذیب اور سماج کے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔
قدیم ہندوستان کے کلچر سماج نظامِ حکومت اور معاشیات کو بنظرِ تحسین

دکھتا ان کے نزدیک قوم پرستی کی کسوٹی تھی۔ ان لیڈروں نے شیواجی مہاراج، رانا پرتاپ اور گرو گوبند سنگھ جیسے تاریخی کرداروں کو قومی ہیرو کی حیثیت سے پرستش شروع کر دی۔ کیونکہ یہ غیر ملکی اقتدار سے برسر آزما ہوئے تھے۔ دوسرے ہندو کانگریسیوں نے بھی اس تعریف و تحسین میں ان کا ساتھ دیا۔ سیٹھ گوبند داس جیسے ادیب نے ایک مسلم صوبیدار سے لڑنے والے راجپوت زمیندار کو بھی ہیرو ؤں کی صف میں جگہ دی۔ بیسویں صدی کا جدید ہندی کا شعری یا نثری ادب بھی اس قسم کے فرقہ وارانہ جذبات کا نمونہ تھا۔ اس طرح انگریزی کے بجائے اردو کے خلاف ہندی کا پروپیگنڈہ بھی اسی ذہنیت کے تحت شروع کیا گیا۔ اردو کو مسلمانوں کی اور غیر ملکی زبان قرار دیا گیا جب کہ ہندی ہندوؤں کی خالص قومی زبان سمجھی گئی تھی۔ دوسرے لیڈروں کو تو چھوڑیئے گاندھی جی جیسے قوم پرست لیڈر زبان کے معاملے میں اکثر متضاد بیان دیتے رہتے تھے۔"

ڈ ڈاکٹر بپن چندر کا مضمون قومی یکجہتی اور سیکولرزم"

ماخوذ شاعر کا قومی یکجہتی نمبر ص۱۸۶، ۱۸۷

یہ تھے وہ اثرات جو انگریزی کی منافرانہ سیاسی اور لسانی پالیسی کی بدولت اکثریت کے ذہنوں میں بھر دیئے گئے تھے ورنہ یہ حقیقت ہے بقول ڈاکٹر تارا چند مرحوم انیسویں صدی سے پیشتر ہندوستان میں مذہبی و سیاسی اور لسانی منافرت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ۱۷۵۷ء میں بھی اگر میر جعفر اور رولاب رائے جیسے غدار نظر آتے ہیں تو دیوان میر مدن اور مہاراجہ موہن لال جیسے وفا کیش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بھی بنگال بہار اڑیسہ میں ہندو مسلمان دونوں شانہ بہ شانہ انگریز کے

خلاف جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ سنیاسی تحریک اور دوسری تحریکوں نے انگریزوں کا سو سال تک ناطقہ بند رکھا۔ سنیاسی تحریک کا سرغنہ منجو شاہ نامی مسلمان فقیر تھا یہ تحریک چالیس سال سے زیادہ چلی اور اس جنگ آزادی میں چراغ علی رہیمی جو دھرانی بھوانی پاٹھک کیبر ناتھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہندو مسلمانوں کا مشترکہ محاذ تھی جس میں بہادر شاہ ظفر، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، احمد اللہ، جنرل بخت خاں، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل کی انگریزوں کے خلاف صف آرائی کس کو معلوم نہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ماحول زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ یورپین مصنفوں اور مفرقہ پرست مؤرخوں کی تعصبانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی تواریخ اور تصانیف اور مشنریوں کی اشتعال انگیز تقاریر اور تصانیف نے ہندوستان کی یکجہتی کی فضا کو زہریلا بنا دیا اور انگریز افسران "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر گامزن رہے۔ پھر ہندو تعلیم یافتہ طبقہ میں آریہ سماجی تحریک نے اور اس منافرانہ میلان کو اور بڑھاوا دیا لیکن پھر بھی ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جس نے قومی یکجہتی کے دامن کو نہ چھوڑا اور لسانی منافرانہ پالیسی سے متاثر نہ ہوا۔ اس لئے ۱۸۵۷ء کے بعد جہاں راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند، راجہ لچھمن سنگھ، راجہ بنارس، بھارتندو ہریش چند جیسے لوگ لسانی منافرت کو ہوا دیتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں قومی یکجہتی کے علمبردار زبانِ اردو میں قومی یگانگت اور اتحاد کا دامن پکڑے ہوئے کافی ہندو شعراء اور ادیب ملتے ہیں۔ واقع نگاروں نے ان کی تعداد ہزاروں میں بتائی ہے لیکن یہ طلقہ آہستہ آہستہ ہندی ہندو ہندوستانی کے زہریلے پروپیگنڈے کے تحت کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد جو بھی لسانی اور سیاسی اثرات ہوئے انھیں میں پچھلی سطور میں تحریر کر چکا ہوں۔ آزادی کے بعد انگریز کے منافرانہ اور تعصب کے جادو سے سحر زدہ افراد کے ہاتھوں میں ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور آئی جنکا ظاہر

اور باطن، قول و فعل یکساں نہ تھا ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت اپنا رنگ لائی۔ ایسے افراد سے اردو کی بقا کی امید رکھنا بھی بے وقوفی کی دنیا میں رہنا ہے۔ کیونکہ اکثریت کے ان سیاسی لیڈران کے ذہنوں کی پرورش انگریز کے منافرانہ اور فرقہ وارانہ ماحول میں ہوئی ہے وہ بدلی نہیں جا سکتی وہ چاہے جہاں شنی ٹنڈن ہوں یا سمپورنا نند یا کے ایم منشی اور سردار پٹیل۔ جواہر لال نہرو یا شریمتی اندرا گاندھی یا چودھری چرن سنگھ یا راج نرائن جی موجودہ وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی صاحب ہوں سب کے ذہنوں کی مزاجی کیفیت یکساں ہے اور ان کے ذہنوں سے یہ اثرات زائل ہو جائیں یہ ناممکن ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ نوے فیصد کانگریسی اکثریتی فرقہ کا ذہن چاہے وہ سیاسی چولا بدل کر کسی پارٹی سے بھی وابستہ ہو جائیں یکساں ہے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ایک مرتبہ کو جن سنگھ راشٹریہ سویم سیوک یا کٹر فرقہ پرست پارٹی سے وابستہ افراد سے تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اردو کی فلاح کے لئے کبھی کچھ قدم اٹھائیں۔ لیکن یہ کانگریسی ذہنیت کے لوگ جن کا ظاہر اور باطن میں بے انتہا تفاوت ہے۔ جن کے قول اور فعل ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں جو زبان سے کچھ کہتے ہیں اور عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اردو کے لئے کچھ نہیں کر سکتے ان سے امیدیں وابستہ کرنا خوابوں کی دنیا میں رہنے کے مترادف ہے اس کا تجربہ ۱۹۴۷ء سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ انگریزوں کی لسانی تقسیم اور حکومت کی منافرانہ پالیسی کتنی کامیاب رہی۔ اس نے ایک متحد قوم کے دو ں کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ یہی صورت اس ملک کے لئے بھی ہوئی اس کی تقسیم کی صورت بھی انگریزوں کی حکمت عملی بے حد کامیاب ہوئی۔ صدیوں سے متحد ہندوستان دو نام اور دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تقسیم کے جتنے خطرناک نتائج سامنے آئے

اس کی کوئی مثال تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتی۔ کروڑوں افراد گھر سے بے گھر ہو گئے
اربوں کی جائداد برباد ہو گئیں۔ لاکھوں افراد اس تعصب کے دیوتا کی بھینٹ چڑھ
گئے۔ اُردو کو بھی تقسیم کا بہت بڑا انعام دیا گیا۔ اس کو ہندوستان میں جہاں وہ
پیدا ہوئی۔ بڑھی پلی وہاں سے ملک بدر کر دیا گیا اور دوسرے ملک میں بھی اسے
مہاجر یا کرایہ دار کی حیثیت سے رکھا گیا۔ تاکہ جس وقت بھی ضرورت سمجھی جائیگی
اس کو وہاں سے بھی نکال باہر کیا جائے اور اس کے بولنے والوں کی بھی
ایک دن بنگلہ دیش کے بہاریوں جیسی حالت ہو سکتی ہے۔ اس ملک میں جسے ایک
نیا نام پاکستان دیا گیا اگر اس ملک کی مطابقت سے اُردو زبان کا نام بھی تبدیل کر دیا جاتا تو اس کا
پاکستان میں مستقبل محفوظ ہو جاتا اور اس کی حیات اس ملک کے ساتھ وابستہ
ہو جاتی اور ہندوستان میں بھی اس کے ساتھ یہ کہہ کر انتقام نہ لیا جاتا کہ یہ ایک بدیسی زبان ہے
اور اب اس ملک سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنے ملک میں بے وطن بنتی جو زبان ہندوستان
کی قومی زبان تھی ان ناموں کی تقسیم نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ اسے کتنا زبردست نقصان پہنچا یا
یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس سیاسی تقسیم کا مسلمانوں سے زیادہ اردو
زبان سے انتقام لیا گیا مجھے ملک کی تقسیم کے سیاسی اثرات کو نہیں بلکہ زبان کی تقسیم کے لسانی
اثرات کو ظاہر کرنا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی ماحول اُردو کے لئے اتنا زہرآلود اور
منافرت انگیز تھا کہ اس کا نام بھی سننا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لسانی تعصب اور ظلم کی مثال
دنیا کی تاریخ میں سوائے پولینڈ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پولینڈ
غلام تھا اور اسے روس اور جرمنی دونوں نے بانٹ رکھا تھا۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ پولینڈ
کلچر ختم ہو کر اس کے کلچر میں ضم ہو جائے اس کے لئے زبان کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی
مدارس میں پولی زبان پڑھانے یا بولنے کی سخت ممانعت تھی۔ مذہبی تعلیم تک بھی نہیں دی جا سکتی
تھی اور نہ مذہبی رسوم یا دعا پولی زبان میں پڑھی جا سکتی تھی۔ بچے بھی مدارس میں پولی زبان
میں بات نہیں کر سکتے تھے اور پولش باشندے گھروں پر بھی پولی زبان نہیں بول سکتے تھے۔
جاسوسی کی جاتی اور پولی بولنے کا جرم کرنے والوں کو سخت سزا بھگتنا پڑتی تھیں۔ گھر، بازار
اسٹیشن، عدالت کہیں پر بھی کوئی پولی زبان میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ روسی مقبوضہ علاقہ میں

روس اور جرمن مقبوضہ علاقے میں عوام جرمنی زبان بولنے پر مجبور رہتے۔ مائیں بچوں کو پوشیدہ طور پر پولی زبان سکھاتی تھیں اور انھیں اس بات کو چھپانے کی ہدایت کردیتی تھیں۔ نوجوان چھپ چھپ کر پہاڑوں میں اپنی مادری زبان کو بولا کرتے تھے۔ اتنے جبروظلم کے بعد بھی پولی زبان پولینڈ سے نہ مٹ سکی اور زندہ رہی اور آج یورپ کی ترقی پسند زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کا دور ہندوستان میں اردو زبان کے لئے پولینڈ جیسا تھا۔ اس کی طرفداری کرنے والے فرقہ پرست اور پاکستانی ایجنٹ سمجھے جاتے تھے۔ ملک کے کسی گوشہ میں بھی اردو کو پناہ نہ تھی۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں، دفتروں سے حکماً اس کو نکال دیا گیا تھا۔ جہاں کہیں بھی اردو کے ادارے رہتے یا وہاں تعلیم دی جاتی تھی یا کتب چھپتی تھیں انھیں بھی بند کردیا گیا اور لوگوں کے دلوں سے بھی زہریلے پروپگنڈے کے زور پر اردو کو نکالنے کی کوشش کی گئی۔ اردو کو کوئی پاس بٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اردو ایک معتوب زبان تھی۔ ایک ایسے موقعہ پر ہی اردو کے چوٹی کے ادیب اور شاعر جناب آنند نرائن ملا نے فرمایا تھا۔ معتوب شمع اردو کو تربت پہ رکھدیا پروانے پھر بھی آئے تو تربت بھی چھین لی ملا لکھنوی۔ ہزاروں افراد جنھیں اردو کے باعث عزت اور ترقی حاصل ہوتی تھی انھوں نے اس کو بالکل ترک کردیا تھا اب ان کو اس میں کوئی معاشی فلاح نظر نہ آتی تھی۔ یہ لوگ ایکدم بدل گئے تھے۔ حکومت کا سب سے بڑا کام اردو دشمنی تھا۔ اردو کے حامی خواہ بھی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ اردو کے طرفداران کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ انھیں غدار سمجھا جاتا تھا۔ تمام اردو بولنے والوں کی زبان کو ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اردو دشمنی کے جذبہ کے تحت، ہندی لکھدیا گیا۔ اردو والوں کی کسی استدعا کو بھی نہیں سنا گیا۔ لاکھوں دستخطوں سے آرڈیننس اردو پر کرم فرمانے کی درخواست کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ کبھی کبھی الکشن آتے تو اردو کے سلسلے میں کچھ وعدے ضرور کئے جاتے۔ لیکن الکشن کے بعد ارباب حکومت کا پھر وہی رویہ ہوجاتا۔ ہزاروں کوسوں دور رہنے والی بدیشی زبان انگریزی دفتروں اور عدالتوں میں آج بھی حکمراں ہے لیکن یہیں پیدا

ہونے والی جنگ آزادی کی مجاہد زبان اردو کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اس
حالت کو قریب تیس سال ہو چکے ہیں اُردو کو زبانی وعدے کے علاوہ کچھ نہیں ملا ہے۔
اس کی ایک نسل اسکے رسم خط سے بے بہرہ ہو چکی ہے۔ دوسری جانب ہندی جب سے
سرکاری زبان بنی ہے کروڑوں روپیہ اس کی ترقی اور توسیع پر خرچ کیا گیا ہے
حکومت اور اکثریتی فرقہ اس کی ترقی کے لئے جنون اور دیوانگی کی حدود کو
پار کرنے والے جذبے سے کام کرتا رہا ہے پھر بھی اس کی ترقی وہ نہ ہوئی جس
کے لئے اتنی جدوجہد کی گئی۔ ہندی کو ادق بنانے کے رجحان نے اسے ادبی حلقوں
تک محدود کر دیا۔ لیکن دوسری جانب اردو کا رسم خط تو اس کے ادبی حلقوں
کی طرح آہستہ آہستہ محدود ہوتا گیا لیکن بول چال کی شکل میں اردو ماحول کی
مغائرت کے باوجود بھی ترقی کرتی گئی۔ آج کی ناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو
کتب کی مانگ اور ہندی نام دیئے جانے والی اردو فلموں اور اردو گانوں
کی مقبولیت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو آج بھی زندہ ہے اور ۹۰ فیصدی
تہذیب اور پڑھا لکھا طبقہ بول چال کے وقت اردو استعمال کرتا ہے اس لئے
کہا جا سکتا ہے کہ عوامی زبان آج بھی اردو ہے۔ اردو کی یہ ترقی غیر محسوس طریقے
سے ہو رہی ہے جیسی کہ اس کی ابتدا سے ہوتی رہی ہے۔ جب کہ کسی حکومت نے
اس کی ہمت افزائی نہیں کی۔ نہ تو مغل دور میں اس کو کوئی لفٹ ملا اور نہ انگریز کے
دور میں اس کی ہمت افزائی کی گئی اور آزادی کے بعد تو اس کے دوست کم اور
دشمن زائد ہیں اسے اپنے ہر جانب قاتل ہی قاتل نظر آتے ہیں۔ بقول ددجتہ
کے کہ یہ سخت جان پھر بھی زندہ ہے اور ترقی کی جانب مائل ہے۔ سچ پوچھے
تو اُردو میں ایک ایسا جادو ہے جو ہر ایک کو اپنی جانب راغب کر لیتا ہے۔ اس
کی ایسی ترقی دیکھ کر روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنے ایک اداریہ

"ہندوستان کی عام فہم زبان" کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ ۱۵ جون ۱۹۵۷ء
کے ہماری زبان میں شائع ہوا۔ اس میں تحریر تھا "آج کی ادبی اردو اور ادبی ہندی
کا فرق صرف ادبی زبان تک محدود ہے۔ عوامی گفتگو کی سطح پر عوام ایک زبان استعمال
کرتے ہیں اس ہندوستانی زبان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر زبان سے
آزادی سے "خزینۂ" الفاظ کو جذب کر لینے کی صلاحیت ہے (اس
خصوصیت کی واحد زبان انگریزی ہے) اس عوامی زبان کی یہ خصوصیت اور
دوسری زبانوں سے الفاظ جذب کر لینے کی صلاحیت ایسی چیزیں ہیں جس
نے ہندوستانی کو واقعی عوامی زبان بنایا ہے۔ اس کی یہ دوسری خصوصیت
اس حد تک ہے کہ تامل تلگو، کناڈی اور ملیالم جیسی غیر مانوس زبانوں تک کے
الفاظ جذب کر لیتی ہے اور بدلے میں ہندوستانی عام الفاظ ان زبانوں میں داخل
پاتے ہیں اس لحاظ سے ہندوستانی ان مقامات پر بھی سمجھی جاتی ہے جہاں ادبی
اردو اور ادبی ہندی کو نہیں سمجھا جا سکتا"

حقیقت میں اصلی اردو یہی ہے جس میں عربی و فارسی ترکی انگریزی سنسکرت
ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور اس زمانے میں
جب کہ ہندی والے دوسری زبانوں کے عام الفاظ کے لئے بھی ہندی کا دامن
تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ عوامی اردو یا ہندوستانی انھیں برابر اپنے سینے سے
لگائے ہوئے ہے اور اپنے دامن کے سایہ میں برابر پناہ دیتی جا رہی ہے۔ فرہنگ
آصفیہ جو اردو کی مستند لغت ہے۔ اس میں اردو کے کل الفاظ کی تعداد
۵۴۰۰۹ ہے ہندوستانی الفاظ کی تعداد ½ ۷۳ فی صدی ہے۔ عربی فارسی
ترکی الفاظ ½ ۲۵ فی صدی ہیں اور یورپی الفاظ ایک فی صدی ہیں۔ اس کو تصنیف
ہوئے ۸۰ سال سے زیادہ ہوگئے۔ اس زمانے کے فارسی عربی ترکی الفاظ کی

تعداد بڑھنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ ہاں سنسکرت ہندی اور انگریزی کے الفاظ ضرور بڑھے ہونگے۔ آزادی کے بعد سے تو ان میں اور بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ میں تو یہ کہنے کو تیار ہوں کہ جب تک ہندوستان میں انگریزی زبان اور مغربی کلچر زندہ ہے عوامی اثر و رسوخ والی آبادی کی اردو کو اس ملک میں کوئی خطرہ نہیں یہ غیر محسوس طریقہ سے باوجود پابندیوں کے ترقی کرتی رہے گی۔ ان حقائق کی بناء پر میری رائے ہے کہ اردو کو ہندوستان گیر بنانا ہے اور اس کے مستقبل کو روشن تر کرنا ہے تو اس کے نام میں لسانی قومیت کی بناء پر جو اجنبیت پائی جاتی ہے اُسے دور کر دیا جائے۔ یہ اس بے وطن زبان کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کی جانب سے لسانی منافرت کا جذبہ کم ہو جائے گا ملک کی ۱۵ تسلیم شدہ زبانیں جن میں پنجابی بنگالی، مرہٹی گجراتی، تامل، تلگو سب کے سب لسانی یونٹ ہیں لیکن دو زبانیں جن میں ایک سنسکرت اور اردو ایسی ہیں جو تا جدار ملک ہیں لیکن سنسکرت اکثریتی فرقہ کی مذہبی زبان ہونے کی حیثیت سے اس کا گھر پورا ہندوستان ہے لیکن اردو بیوں تو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا علاقہ کوئی نہیں اگر ہے تو وہی علاقہ ہے جو ہندی کا ہے۔ اگر اس کا نام ہندی یا بھارتی یا ہندوستانی اردو یا کوئی نام جو ملک کے نام کی مناسبت سے نام رکھ دیا جائے تو اس کا علاقہ پورا ہندوستان ہو جائیگا۔ گھر یلو طور پر ہم اس کو اردو کہیں تو بھی کوئی بات نہیں۔ ہندوستان میں یوسف خاں کا وقار دلیپ کمار کے نام سے زیادہ ہی ہوا۔ کچھ کمی نہیں آئی۔ پھر ایک بات پر غور فرمائیے کہ وہ زبان جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہند و مسلم کلچر ہی نہیں بلکہ ایرانی یونانی عرب ترک منگول اقوام اور اہل ہند کے میل جول سے وجود میں آئی اور مسلم دور حکومت میں پروان چڑھی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس زبان کی

تعمیر میں ہندو قوم کا مسلمانوں سے زیادہ حصہ ہے بلکہ اس کے معمار یہی وہی زبان انگریزی ڈپلومیسی کے طفیل بے گھر بے سہارا اور منافرت کی رزم گاہ بنادی گئی۔
اس کی بے گھراور بے وطنی کی تشریح میں کچھ مندرجہ بالا سطور میں تحریر کر چکا ہوں جیسا کہ ہر اہل ادب جانتا ہے کہ یہ انیسویں صدی سے پہلے ہندی، ہندوی، ہندوستانی یا اردوئے معلیٰ اور ریختہ کہلاتی تھی۔ کچھ لوگ اسے کھڑی بولی یا کھری بولی بھی کہتے تھے اور پورا ہندوستان اس کا وطن تھا۔ آج اپنے اردو نام کی وجہ سے اپنے ملک میں اجنبی ہے اور بے وطن ہے نہ ہندوستان میں اس کا کوئی لسانی وطن ہے نہ پاکستان میں برصغیر پاک قریب بیس بائیس لسانی حلقوں میں بٹا ہوا ہے۔
ہندوستان میں پندرہ اور پاکستان میں چار زبانیں صوبائی زبانیں مانی جاتی ہیں ہر ایک صوبہ اپنی صوبائی زبان کے مقابلہ میں اردو کو کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں پاکستان میں بھی جہاں کی یہ سرکاری زبان ہے اس کا کوئی لسانی حلقہ نہیں اور یہ ہندوستان میں جہاں اس کا جنم ہوا ایک آوارہ مسافر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنگلہ دیش کی حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ پاکستان سے اس کی علیحدگی بھی لسانی منافرت کی وجہ سے عمل میں آئی۔ مغربی بنگال والے بنگالی زبان کی بناء پر مشرقی بنگال کے باشندوں سے ایک قربت محسوس کرتے ہیں زبان کے ایک نام ہونے کا رشتہ ہی ایک ایسا رشتہ تھا۔ جو ہندو بنگالی اور مسلم بنگالی کی منافرت کو کم کرتا رہا اگر ان زبانوں کے نام بھی ہندی، اردو کی طرح دو نام ہوتے تو ان کے درمیان بھی لسانی خلیج حائل ہو جاتی۔

ہندی کے طرفدار رسم خط کو ہندی اردو جھگڑے کی جڑ سمجھتے ہیں اس بات کو ہندی کے سب ہی محققین نے لکھا۔ پنڈت پدم سنگھ شرما نے اپنی تخلیق "ہندی اردو ہندوستانی میں اس موضوع پر اس طرح خیال فرمایا ہے

"فارسی عربی ترکی پرتگالی، ولندیزی اور فرنگی شبد بنگلہ مراٹھی گجراتی آدھ بھاشاؤں میں ملے جلے پائے جاتے ہیں جہاں انکی سنکھیا بڑی ہوئی ہے وہاں انکی ادھک پریوگ کی شیلی بھی پتھک (جدا) ہوگئی ہے جیسے گجراتی میں ہندو گجراتی کے ساتھ ساتھ فارسی گجراتی کی ایک پتھک شیلی چلتی ہے جس میں فارسی شبدوں کی بہتات ہے سوبھاگیہ سے وہاں لپی بھید کا پرشن کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ نہیں تو شاید ہندی اردو کا سا جھگڑا وہاں بھی کھڑا ہو جاتا۔"

لیکن مجھے مصنف کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ انیسویں صدی سے پیشتر اس زبان کا کوئی مستقل نام تھا اور یہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ زبان ایک تھی ایک بات واضح ہے کہ جس طرح ابتدا سے سنسکرت ہندوستان کی دیسی پراکرتوں پر ہمیشہ اثر انداز رہی ہے۔ اس طرح فارسی بھی کچھ ایران اور ہندوستان کے قدیم تعلقات اور تہذیبی، ثقافتی رشتوں کی بنا پر اور مسلم دور حکومت میں سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی تمام انڈو ایرین زبانوں کو متاثر کرتی رہی ہے جیسا کہ پنڈت پدم سنگھ شرما کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تاثرات نے کئی ہندوستانی زبانوں کو دو دائروں میں تقسیم کردیا تھا۔ گجراتی کی طرح بنگالی بھی مسلم بنگالی اور ہندو بنگالی میں بٹ گئی تھی یہی حال پنجابی اور ملایلم کا تھا۔ ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے اردو ہندی کو مسلم کھڑی بولی اور ہندو کھڑی بولی کے ناموں سے پکارا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو اور جدید ہندی جنکا مشترکہ نام ہندی یا ہندوی تھا۔ اردو اور ہندی کے ناموں میں تقسیم نہ کیا جاتا اور ایک نام کو ایک فرقہ دوسرے نام کو دوسرے فرقہ سے متعلق نہ کر دیا جاتا تو یہ لسانی اختلاف کبھی نہ پیدا ہوتا۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما بھی "ہندی کے اتہاس" ص ۸۶ پر

لکھتے ہیں۔

"اردو اور آدھنک ساہتیک ہندی سگی بہنیں ہیں۔ وگست ہونے پر ان دونوں میں جو اثر ہوا اُسے روپ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو ہندوانی بنی رہی اور دوسری نے مسلمانی دھرم گرہن کر لیا۔"

قدیم سے ہندو مسلمان اس قومی زبان کو اردو رسم خط میں لکھتے آئے تھے اور مل جل کر کام کرتے چلے آئے تھے۔ ہاں بھاشا کا ضرور رسم خط ناگری تھا ڈاکٹر فلین نے تاریخ شعرائے اردو ص ۲ پر اردو کی تین قسمیں لکھی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اردو کی تین قسمیں ہیں۔ دو قسمیں ہندوستان کے شمال میں بولی جاتی ہیں یعنی اردو اور برج بھاشا اور تیسری قسم دکن میں بولی جاتی ہے جسے دکنی کہتے ہیں۔ یہ سب زبانیں فارسی ہندی اور دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہیں مسلمان حروف فارسی میں اور ہندو اپنے آباؤاجداد کے اتباع میں دیوناگری حروف لکھتے ہیں۔

"اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ منافرت فورٹ ولیم کالج کے طفیل میں پیدا ہوئی ورنہ یہ اختلاف پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس کی مثال مسلم گجراتی، ہندو گجراتی، مسلم بنگالی ہندو بنگالی، ہندوستانی پنجابی اور پاکستانی پنجابی، مسلم ملایم جو عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہے جس میں مساجد میں خطبے تک پڑھے جاتے ہیں اور غیر مسلم ملایم رسم خط میں لکھی گئی ہے لیکن زبانوں کے رسم الخط یا فرقہ وارانہ تقسیم سے ہندو مسلمانو میں ان صوبوں میں لسانی تفاوت کی بنا پر کبھی تعصب پیدا نہ ہوا۔ یہاں اگر اردو ہندی کی طرح ان زبانوں کے نام جدا رکھ کر دو فرقوں میں بانٹ دیا جاتا تو اُن میں بھی یہ تعصب پیدا ہو جاتا۔ آج مرہٹی، بنگالی، آسامی،

ملایلم، تلگو، تامل، کنڑی، پنجابی، کشمیری صوبوں میں رہنے والا مسلمان
یکساں طور پر زبانوں کو اپنی مادری زبان سمجھتا ہے اور اردو پر اسے ترجیح
دیتا ہے۔ اس لئے اس کے نام میں کچھ اردو وطن سے مناسبت ہے۔ میں
سید سلیمان ندوی، حبیب الرحمن شروانی، مولوی عبدالحق اور مشہور محقق ڈاکٹر
الیس بیدی کی اس رائے سے متفق ہوں کہ اس قومی زبان کا اردو نام اے
راس نہیں آیا۔ ہندی ہندوی یا ہندوستانی رہتا تو اتنا ضرر رساں نہ ہوتا۔ ہاں اگر
اُردو نام کے بجائے اس کا ایک پرانا نام جو علاقہ مدراس (تامل ناڈ) میں کسی زمانے
میں بولا جاتا تھا "مسلمانی" ہی (جب کہ اُردو کو زبردستی مسلمانوں کی زبان سمجھا
جاتا ہے) رکھدیا جاتا تو مسلمانوں کو ایک زبان اور اردو کو ایک لسانی رشتہ مل
جاتا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمان کی کوئی اپنی زبان نہیں عربی اس کی مذہبی زبان
قومی زبان ہے جس سے اس کا صرف مذہبی رسوم کی حد تک اس کا تعلق ہے۔ جیسے
زبان کے تعلق سے اس کا کوئی تعلق عربی زبان سے نہیں۔ پورے برصغیر کے مسلمان
چاہے وہ کسی صوبے کے بھی ہوں اس کی عربی زبان کی طرح عزت کرتے اور کیونکہ
اُردو کا سیکھنا عربی سے زیادہ آسان ہے۔ ایک رابطہ کی روزمرہ کی استعمال
کی زبان ہے۔ ہر مسلمان اس کو بہت زیادہ ذوق شوق سے سیکھتا اور اسے
بھی اپنی مادری زبان سمجھتا۔ اس وقت یہ زبان ڈھائی کروڑ باشندوں کی زبان
نہ ہو کر برصغیر کے ستائیس کروڑ مسلمانوں کی زبان ہوتی۔ دوسرے اسلامی ممالک
بھی اس کے اسلامی نام کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ اب حالت یہ ہے
کہ مسلمان اردو کو تنہا اپنی زبان نہیں کہہ سکتے۔ ہندو اکثریت نے اسے ہندی
کے نام سے اپنا رکھا ہے۔ وہ اردو نام سننا بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں۔
رہی ان صوبوں کی بات۔ جہاں صوبائی زبان خود موجود ہے۔ وہاں ہمیشہ اردو

کے مقابلے میں مادری زبان کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ ہندوستان ہو یا پاکستان
جہاں صوبوں میں لسانی سوال اٹھا۔ بڑے بڑے اردو ادیبوں نے جن کو وقار، عزت اور دولت
بھی اردو نے دی تھی صوبائی زبان کو مادری زبان سمجھ کر اردو کی مخالفت
پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کے پطرس بخاری، دین محمد تاثیر، حفیظ
جالندھری اور فیض احمد فیض جیسے لوگوں کی مثال دی جاسکتی ہے جنھوں نے اپنی قومیت
کی بنا پر پنجابی کے مقابلہ میں اردو کو پس پشت ڈال دیا۔ بنگلہ دیش اور تامل ناڈ
کی مثالیں بھی بھولی نہیں جاسکتی۔ جس میں بہت سی جانیں لسانی جذبات کی بھینٹ
چڑھیں۔ اب سے دو سال قبل پاکستان میں سندھی اور اردو کا خونریز تصادم
ہوچکا ہے۔ سندھی طالب علموں نے علامہ اقبال کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے
تھے۔ بیچاری اردو کا اپنے نام کی اجنبیت کی وجہ سے نہ پاکستان میں گھر ہے اور نہ
ہندوستان ہی میں۔ پاکستان میں اردو کی کس مپرسی دیکھ کر بابائے اردو مولانا
عبدالحق پر مایوسی طاری ہوگئی تھی اور شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی جو پاکستان
کو اردو کی جنت سمجھ کر گئے تھے ان کو بھی کچھ عرصہ بعد ان الفاظ میں اپنے جذبات
کا اظہار کرنا پڑا۔

یوں کراچی میں ہوں جس طرح کہ کوفہ میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار جفا جور گرم

آخر اُردو کا نام کیا ہو؟

"ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیے، جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے۔ فقط اُردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصوّر ذہن میں نہیں آتا۔" نقوش سلیمانی۔

جب اتنا سب کچھ لکھ چکا تو مجھ سے سوال کیا گیا کہ پھر اردو زبان کا نام کیا ہو۔ یہ کام حقیقت میں ارباب ادب اردو کا ہے۔ کہ اس دور میں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ کیونکہ میں اردو ادب کے مبتدیوں میں سے ایک ہوں لیکن پھر بھی کچھ لوگ مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ کی رائے میں اردو کا کیا نام ہونا چاہیے۔ میرے کئی احباب میری رائے جاننے کے بے حد خواہش مند ہیں۔ انھیں کے اصرار پر میں یہ چند سطور تحریر کر رہا ہوں۔ ویسے پچھلے اوراق میں بھی میں نے اس موضوع پر اپنا خیال پیش کیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اُردو زبان کا رسم خط تبدیل کرنے کے بے حد خلاف ہوں۔ زبان جسم ہے رسم خط اس کی کھال ہے۔ جسم سے کھال جدا نہیں ہو سکتی اور مجھے اس بات سے اتفاق بھی نہیں ہے جس کے لیے سردار جعفری اور کچھ لوگ تیار ہو گئے تھے کہ انگریزی والے اُردو کے سب شعراء اور ادیبوں کو ہندی کے دائرہ میں شامل کر لیں تو وہ اردو کو ہندی کا حصہ تسلیم

کریں گے۔ لیکن ہندی والے اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہو بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ اردو شاعری اور زبان میں اتنی کشش ہے دوسرے یہ بول چال کی زبان ہے اس کے شعراء اور ادیبوں کو شامل کر لینے سے ہندی کی ادبی اور شاعرانہ انفرادیت خطرے میں پڑ جاتی ہے لیکن میں اتنا ضرور چاہتا ہوں اردو میں پرانی روش کو ترک کر کے قدیم اردو کے شعراء چاہے وہ برج بھاشا اور اودھی کے ہوں یا دکنی کے سب کو اردو ادب میں شامل کیا جائے۔ کیونکہ اس ۳۰ سالہ ہندی کے دور میں ان قدیم اردو کے شعراء سے موجودہ اردو داں نسل کافی واقف ہو چکی ہے اور پھر یہ ان زبانوں کی موجودہ شکل قدیم اردو سے مشابہت رکھتی ہے اور ان زبانوں کا اس کی تخلیق میں کافی حصہ رہا ہے۔ دوسرے اگر اردو کا نام بدلنے سے اردو کو استفادہ پہنچتا ہے اور ادبیت حاصل ہوتی ہے تو میں اس کا دوسرا نام رکھنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔ ہاں اسے دوسرے ناموں سے بھی پکارا جا سکتا ہے جیسا کہ اسے ماضی میں اکثر پکارا جاتا تھا۔ صرف تنہا اردو نام اس کے لئے انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ اور یہ تنہا ہی رہ گئی۔ مسلمان جن کے سر اس کو زبردستی منڈھا گیا تھا اس کو تنہا اپنا نہیں سکتے اس کو ہندو مسلمان سکھ سبکی مشترکہ میراث بتاتے ہیں لیکن ہندو سکھ عیسائی بھی اس کو اپنانے کو تیار نہیں۔ ہندو ہندی کو سکھ پنجابی کو اور عیسائی انگریزی کو اپنی مادری زبان بتلاتے ہیں۔ ہندوؤں کو ہندی اور پنجابیوں کو پنجابی نام دوسرے زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ کشش رکھتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ سات سمندر پار کی زبان انگریزی تو لوگوں کو بدیشی نہیں معلوم ہوتی اور اردو جو یہیں پیدا ہوئی ان کے لئے بدیسی ہے۔ انگریزی زبان اب بھی پورے ہندوستان پر حکومت کر رہی ہے اس کی حکومت کبھی کی ختم ہو گئی ایسا نظر نہیں آتا اور اب تو وہ ایک صوبہ ناگالینڈ

کی قومی زبان بھی بنادی گئی ہے لیکن اردو[1] ایک قومی زبان ہوتے ہوئے بھی علاً بدیسی زبان بنادی گئی ہے۔ اس کا نہ ہندوستان میں علاقہ ہے اور نہ پاکستان میں ہندوستان کے ہی ایک حصہ کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ ایک کروڑ لوگ ترک وطن کرکے ہندوستان سے پاکستان گئے اور اتنے ہی افراد پاکستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آنے پر مجبور ہوئے۔ آنے جانے والوں دونوں کی مادری زبان اردو تھی۔ ہندوستان آنے والوں کی موجودہ نسل کی زبان ہندی کہلانے لگی۔ حالانکہ بول چال کی زبان جسے وہ ہندی کہتے ہیں اب بھی اردو ہے۔ یہاں حکومت کی ہندی نوازانہ پالیسی کی وجہ سے یہ رسم خط سے بے بہرہ ضرور ہو گئی ہے۔ اور پاکستان میں ویسے تو سرکاری زبان اردو بنادی گئی ہے لیکن وہاں آبادی بے ملک ہے ہندوستان سے پاکستان پہنچنے والے ایک کروڑ افراد کو مکان جائداد اور روزگار اور وہاں کی شہریت تو مل گئی لیکن آج تک اردو کو نہ رہنے کا ٹھکانا ملا نہ وہاں کی شہریت۔ صوبہ سرحد کے باشندے کہتے ہیں کہ ہماری مادری زبان پشتو ہے۔ صوبہ پنجاب کے لوگ اپنی مادری زبان پنجابی بتاتے ہیں اور بلوچی اور سندھی اردو پر اپنی اپنی صوبائی زبانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ صرف

---

[1] بقول ڈاکٹر احتشام حسین دستورِ ہند میں اردو کو بھی اس ملک کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے لئے کوئی علاقہ معین نہیں ہے اس لئے اگر علاقہ کوئی ہوسکتا ہے تو وہی ہے جسے ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے گویا اردو ہندوستان کی ایک تسلیم شدہ زبان ہے مردم شماری کی رپورٹوں میں اس زبان کو مادری زبان تسلیم کرنے والوں کی معتدبہ تعداد موجود ہے لیکن ان کے لئے کوئی علاقہ سرکاری طور پر نہیں ہے پاکستان میں بھی علاقائی حیثیت سے اردو کا کوئی علاقہ نہیں ہے اگرچہ وہاں کی عام مشترکہ زبان ہے۔ مقدمہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

مہاجرین کی مادری زبان اُردو ہے لیکن ان کی تعداد پاکستان میں مجموعی آبادی کا دس فیصد سے زیادہ نہیں اس طرح پاکستان میں مشکل سے چودہ پندرہ فیصد لوگ ایسے ہیں جو اُردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ اس لئے جب تک پاکستان میں بولی جانے والی اردو کا نام تبدیل کر کے پاکستان کی مطابقت سے پاکستانی یا پاک زبان یا پاکوی یا پاکیزہ یا اور کوئی نام جسے وہاں کے اہل ادب موزوں سمجھیں نہیں رکھا جاتا اس کا وہاں پر بھی مستقبل تاریک ہی ہے۔ واضح ہو مسٹر محمد علی جناح مرحوم کو بھی وہاں کے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے ایک حصہ کا نام پاکستان رکھنا پڑا تھا۔ اگر اس وقت ہی اس زبان کو جسے وہاں کی سرکاری زبان بنایا گیا ہے اس کے وطن کی مطابقت سے اس کا نام تبدیل کر دیا جاتا تو پاکستان میں اس زبان کا مستقبل پائیدار بن جاتا اور جو اس زبان سے مختلف صوبوں کے افراد کو لسانی عصبیت پیدا ہوئی وہ کبھی نہ پیدا ہوتی۔ اس زبان کو پاکستان کی کوئی حکومت کسی بھی وقت ملک بدر کر سکتی ہے۔ یا خدانخواستہ کبھی ملک کی یک جہتی کو کبھی نقصان پہنچا تو اس زبان کو کوئی سینے سے لگانے نا ممکن سا نظر آتا ہے۔

دوسرا زبردست نقصان اس کے ناخداؤں کے مرزا عزیز مرحوم مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کی بات نہ ماننے کی وجہ سے پہنچا اگر اس وقت ان کی بات مان کر اس کا نام ہندوستانی رکھ دیا جاتا اور اردو نام اس وقت ترک کر دیا جاتا تو ایک تو اس لسانی تعصب کا زور جو انگریز نے سو سوا سو سال سے پھیلا رکھا تھا کم ہو جاتا اور جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور ہندوستان کے ایک حصے کا نام پاکستان رکھا گیا اگر اس وقت اردو کا نام ہندوستانی ہوتا تو بانیان پاکستان اپنی سرکاری زبان کا نام بھی تبدیل کرنے پر مجبور ہوتے اس اردو کے پاکستان

میں سرکاری زبان بننے سے ہندوستان میں اُردو کے خلاف جو منافرت کی لہر دوڑی تھی وہ بھی نہ دوڑتی۔ دوسری جانب پاکستان میں بھی اُردو کا مستقبل روشن اور پائیدار ہوتا۔ ادھر ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو سے ہندوستان میں اتنی زبردست انتقام نہ لیا جاتا اور ہندی کو پارلیامینٹ میں ایک ووٹ کی اکثریت سے کامیابی حاصل کرنے کا موقع بھی نہ حاصل ہوتا اور اگر یہ موقع مل بھی جاتا تو آئین کی ہندرہ زبانوں میں شامل ہونے کی وجہ سے اسکا ہندوستانی نام اپنے اُردو رسم خط کے ساتھ اس کی ہندوستان کی سرزمین سے وابستگی اور وطنیت ظاہر کرنے کا عنوان بنتا اور وہ اُردو کے نام سے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔

[illegible] دستان میں لسانی تعصب عروج پر ہے۔ بقول پروفیسر گیان چند جین کہ یہی حال رہا تو میں ہندوستان بارہ تیرہ لسانی خانوں میں تقسیم ہو جائیگا۔ جہاں مینار بابل کی طرح ایک کی بات دوسرا نہ سمجھے گا۔ ہر صوبہ کے لوگ اپنی علاقائی زبان کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ پھر ایسے میں بیچاری اُردو کو کون پوچھتا ہے۔ بنگال، مدراس (تامل ناڈو) آسام، آندھرا، مہاراشٹر، کرناٹک، پنجاب کسی بھی صوبہ کا باشندہ ہو خواہ کسی فرقہ سے منسلک ہو زبان کے مرکز پہ سب مذہبی قیود و حدود ختم کر دیتا ہے کہ اُردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندو مسلمان سکھ سب کی زبان ہے۔ یا پورے ہندوستان کے رابطہ کی زبان ہے۔ یہاں اگر صوبائیت

سلہ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے بھی ایک موقع پر کہا "ہندوستان کی حکومت نے زبردست غلطیاں کی ہیں ایک تو ہندوستان کے صوبوں کی لسانی تقسیم اور دوسرے پنچایت راج اسکیم"۔ رسالہ زبان اور مسائل زبان از عبدالغفار شکیل نوشہ :- دونوں اسکیمیں ہندوستان میں راس نہ آسکیں ایک نے صوبوں میں تعصب اور دوسرے نے گاؤں میں افتراق اور پھوٹ کی بنیاد ڈالی۔

ہر چیز پر حاوی ہو جاتی ہے یوں تو اردو کا علاقہ پورا ہندوستان اور پاکستان ہے اور حقیقت میں اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ اگر کوئی علاقہ ہندوستان میں اردو کا کہا جا سکتا ہے تو اس علاقہ پر جدید ہندی نے قبضہ کر رکھا ہے وہ اس کو پاس بھی بٹھانے تک کے لئے روادار نہیں۔ کیوں بٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ایک الگ سوال ہے کسی تعصب کی بنا پر یا ذاتی مخالفت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک وجہ ہو لیکن میری رائے میں اردو کو پاس نہ بٹھانے میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اردو کے پاس بٹھانے سے ہندی کو اپنا وجود ہی خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ اردو زبان میں اتنی کشش ہے کہ کوئی شخص کبھی بول چال کی زبان میں ہندی کو ترجیح نہیں دیتا وہ بلکہ آسان اور عام فہم اردو کو ہی اپناتا ہے وہ نظیر اکبرآبادی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہے اقبال اور نرالا کی زبان میں نہیں۔ اردو زبان کی یہی خوبی اس کی دشمن بنی ہوئی ہے۔

مغلوں نے اس کو منہ نہیں لگایا حالانکہ گھروں میں وہ دن رات اسے ہی بولتے تھے۔ انگریزوں نے تو اسے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی اس کو دو مختلف ناموں میں دو فرقوں میں تقسیم کر کے اسے کمزور کر دینے کی طرح طرح کی مفسدانہ سازشیں کیں۔ لیکن یہ سخت جان پھر بھی نہ مٹی بلکہ اور زیادہ ترقی پذیر ہوئی جس کے بارے میں پچھلے صفحات میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ آزادی وطن کے بعد انگریزوں کے بوئے ہوئے زبان کی منافرت کے بیج نے ایک شجر کی شکل اختیار کر لی۔ ہندی سرکاری زبان بنا دی گئی اور اردو کی زندگی ہی ختم کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتیار، زہریلے انجکشن استعمال کئے گئے اور ایک طرح پر اسے مردہ تصور کر لیا گیا۔ لیکن یہ عجیب مردہ ہے کہ زندوں پر حاوی ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ مارنے والوں سے بچانے والا قوی تر ہے جب اس کے مخالفوں نے دیکھا کہ یہ سخت جان مرتی بھی نہیں اور دنیا میں بدنامی

مفت میں ہوتی ہے تو کچھ آنسو پونچھے گئے یا دشمن کو مار کر اس کی قبر پر پھول
اردو اکیڈیمیوں کی شکل میں چڑھائے گئے۔ لیکن پاس بٹھانے کے لئے کوئی بھی
کسی بھی شکل میں بھی تیار نہیں جو بات تیس سال سے ارباب وطن اور حکمراں
طبقے کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی "صاف کہتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"
یہ بات پچھلے ۳۰ سال سے ہندوستان میں رہی ہے۔ کوئی بھی حکومت مرکز میں ہو
صوبا اردو کی کبھی بھی بہی خواہ نہیں رہی آخر کو ایک صاف باطن شخص نے یہ بات واضح
کر دی کہ آپ بیکار جستجو اور کوشش کریں اور امیدیں باندھیں۔ ہندوستان میں
اردو کے لئے کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا جس کو وہ اپنا کہہ سکے کیونکہ اکثریت
کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اردو کو اگر ملک میں کسی طرح کی بھی سرکاری
حیثیت دی گئی تو اُسے اُنکی زبان کا وجود خطرے میں پڑھ جائے گا۔ اردو والوں
کے ووٹ کی خاطر کوئی پارٹی کچھ بھی وعدہ کرلے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اردو کے
بارے میں کوئی بھی عملی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اردو کو ہندوستان میں برج بھاشا
کی طرح ہمیشہ غیر سرکاری زبان کی طرح گذارا کرنا ہے۔ نیظر اکبر آبادی کی اردو کو کوئی
خطرہ نہیں۔ یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ ہاں اپنی عادت کے مطابق
کچھ ہندی کے الفاظ ضرور اپنائے گی۔ رسم خط اس کا ضرور محدود ہو جائے گا۔
عوامی سطح پر مستقبل روشن ہے۔ بالآخر ایک دن اپنی حقیقت اپنے قاتلوں سے
بھی منوا کر رہے گی۔ یہ حقیقت بھی ہے جو زبان محدود ہو کر سرکاری زبان بنا دی

لے لکھنؤ میں شری مرارجی ڈیسائی نے صاف طور پر یہ بات کہی۔

لے "اردو کو جاننے والے سارے ہیں پڑھنے والا کوئی نہیں۔ بلکہ اب
چاہنے والوں سے مارنے والوں کی تعداد زیادہ ہے مگر بچانے والا قوی
تر ہے۔ اس لئے آج تک زندہ ہے"
مجلہ جہت دردمی ۱۷۔ اردو کے ہندو شعراء

گئی۔ وہ کچھ عرصہ میں عوام سے دور تر ہوتی گئی۔ سنسکرت، پالی گدھی۔ فارسی کسی وقت میں سرکاری زبانیں تھیں۔ آج اُن کے بولنے والے کہیں نظر نہیں آتے۔ برج بھاشا اودھی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، سندھی اور اردو جنھیں کبھی سرکاری سرپرستی نہیں نصیب ہوئی۔ آج بھی موجود ہیں اور رہیں گی! ان کا ادب بھی زندہ رہے گا۔ اردو تو ایک عظیم ادب اور کلچر کی مالک ہے۔ رہی حکومت اور تنگ نظروں کے تعصب اور زبردستی کی بات تو کوئی زبان ظلم و جبر سے فنا نہیں ہوا کرتی۔ پچھلے صفحات میں پولینڈ میں روسیوں اور اور جرمنوں کے پولی زبان کے ظلم وستم کے بارے میں تحریر کر چکا ہوں۔ انھیں حالات کو دیکھ کر سور گیہ سونتی کمار چٹرجی جو کبھی اردو کے کٹر مخالف تھے نے تحریر کیا ہے۔

"مسلمانوں کی ہندوستانی اردو کے نام سے مشہور رہوئی جس کی ترقی حیرت انگیز سرعت سے فارسی اور عربی کا اسلوب اور طرز اس نے اختیار کی۔ مگر آزادی کے بعد اس زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک ہوا اور ہندی اور اردو کے درمیان خط فاصل کھینچنے کے لئے ہندی میں ادق اور نامونس الفاظ ٹھونسے جانے لگے اور اس دیش کی ہر دلعزیز زبان کی کشش لسانی عصبیت کے طوفان میں ہچکولے کھانے لگی۔ اس اندھے تعصب کی وجہ سے ہندی عوامی زبان بننے کی بجائے اجنبی سی بنتی جا رہی ہے۔ عوام سے اس کا گہرا رشتہ ٹوٹنے لگا ہے۔ اگر تعصب کا طوفان وقت کے ساتھ دب گیا اور ہندی کو آسان بنانے کی تحریک کامیاب ہو گئی تو ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں رہے گا آپ اسے ہندی کہہ لیں چاہے ہندوستانی کی سب سے اہم اور مقبول زبان ہے۔ یہ واحد بولی ہے جو ہندوستان

کی قومی زبان کا رتبہ رکھتی ہے"۔

(اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف لنگویج از سونتی کمار چٹرجی۔ص ۵۱)

بہرحال میں اب اس باب کے اصل موضوع پر آتا ہوں کہ جب اس عوامی زبان کا نام اردو بقول ڈاکٹر کے۔ایس بیدی راس نہیں آیا تو پھر اس کا نام کیا رکھا جائے۔ جب اردو زبان کے اس کی ابتدا سے پچھلی صدی کے اختتام تک ایک سے زائد نام رہے ہوں اور ایک اجنبی نام کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا ہو تو اس کے بدل دینے میں کیا حرج ہے۔ اگر اس کا نام اردو نہ رکھا جاتا اور دونوں رسم خط میں لکھی جاتی تو یہ مسئلہ ہی وجہ منافرت نہ بنتا اور یہ دنیا کی تیسری بین الاقوامی زبان ہوتی۔ بہرحال قومی زبان کے مستقبل کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے کہ اس کا موزوں نام کیا ہو۔ اس کے پرانے ناموں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں کئی نام ایسے نظر آتے ہیں جنھیں اپنایا جا سکتا ہے وہ ہیں ہندی ہندوی ہندوستانی اور مسلمانی۔ یہاں ایک نیا نام میرے ذہن میں آیا ہے اور وہ ہے بھارتی۔ ان ناموں کو مختصر طور پر اور مختلف زاویوں سے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ہندی۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اردو کا قدیم نام ہندی تھا اور زبان کے معنوں میں ہندی لفظ خسرو سے لے کر غالب کے وقت تک بولا جاتا رہا ہے اور دورِ حاضر میں سب سے آخری مرتبہ علامہ اقبال نے ہندی لفظ اردو زبان کے لئے استعمال کیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ لفظ دیوناگری میں لکھی جانے والی سنسکرت آمیز کھڑی بولی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اب اردو کہلانے والی موجودہ زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے یہ نام کبھی نہیں مل سکتا۔ ہاں کیونکہ ہندی اردو کا سب سے اول اور سب سے آخری نام ہے اور یہ زبان شورسینی پراکرت کی ایک ترقی آمیز جدید زبان کی شکل ہے۔ اس لئے اگر اس کا رسم خط فارسی

رہتے ہوئے اگر ترقی پسند ہندی رکھ دیا جائے تو بہت موزوں رہے گا۔ جن لوگوں
کو صرف ہندی نام سے محبت ہے اور بات چیت اردو میں کرتے ہیں وہ ترقی پسند
ہندی کے نام کو پسند فرمائیں گے اور ویسے بھی بہت سے اس نام سے فوائد
حاصل ہوں گے۔

ھندوی۔ اس زبان کا دوسرا موزوں نام میری نظر میں ہندوی ہے
یہ بھی اردوئے قدیم کا پرانا نام ہے اور خسرو سے ۱۸۵۷ء تک اردو مصنفین نے
اسے استعمال کیا ہے اس کے نام کو ہم نے بالکل بھلا دیا ہے۔ کیونکہ ہندی
سرکاری زبان ہے۔ اس لئے اردو کا اپنا نام اگر ترقی پسند ہندی رکھیں گے تو
اسے ہندی سے جدا نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لئے ہندی سے اردو کے لئے ہندوی
نام بہتر رہے گا۔ یہ نام ہندی کے جوڑ کا بھی ہے اس کا اہم عنصر بھی ایک تو یہ
اس کا اردو سے پرانا رشتہ ہے دوسرے اردو کا ہندوی نام رکھ دینے سے
اس کی ہندوستان سے جو اجنبیت بھی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی اور
ہندوی نام ہندی کے برابر کی چیز ہے۔

اُردو یا ھندوستانی اُردو ۔ "لسانی تاریخ میں یہ واقعہ ہے کہ
بولیاں ایک دوسرے سے جدا ہو کر مختلف زبانیں بن جاتی ہیں۔ اطالوی اور
فرنچ یا جرمن اور ڈچ کسی زمانے میں ایک زبان کی بولیاں تھیں۔ یہ بہت ممکن
ہے سو دو سو سال میں برطانیہ اور امریکہ کی انگریزی یا ہندوستان اور
پاکستان کی اردو مختلف زبانیں ہو جائیں"

(اردو میں لسانی تحقیق۔ ص ۱۵۴۔ ڈاکٹر گیان چند جین)

اردو لفظ کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے کہ اس زبان کے لئے تنہا
اردو لفظ صرف سو ڈیڑھ سو سال سے بولا جاتا ہے اور ایک طبقہ کو اس
سے جذباتی لگاؤ ہے جس کو ختم کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں
اگر اس نام کو تبدیل کرنا ممکن نہیں تو اس نام کے آگے اگر ہندوستانی لگا

دیا جائے یعنی ہندوستانی اردو تو بھی میری رائے میں بے حد موزوں رہے گا۔ جیسے ہندوستان کا مسلمان ہندوستانی مسلمان پاکستان کے مسلمان پاکستانی مسلمان، ایران کا مسلمان، ایرانی مسلمان وغیرہ کہلاتا ہے۔ اس سے اردو کو ہندوستان کی شہریت مل جائے گی اور ہندوستان اس کا اس طرح کا وطن ہو جائے گا جس طرح ہندوستانی مسلمان کا ہے۔

ہندوستانی : ایک خاص نام میری نظر میں ہندوستانی ہے یہ لفظ جہانگیر کے زمانے سے اردو کے لئے کہا جاتا رہا ہے۔ فرشتہ نے اسے استعمال کیا ہے۔ یورپین مصنفوں میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو کو ہمیشہ ہندوستانی کے نام سے پکارا ہے۔ بابو شیو پرشاد سے لے کر گاندھی جی تک بہت لوگ ہندی اردو دونوں کو ہندوستانی کا نام دیتے رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالحق اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی اردو کا نام ہندوستانی رکھنا چاہتے تھے اور یہ نام اب بھی بول چال کی عام فہم اردو والے اسے ہندی ہندوستانی کے نام سے پکارنے لگے۔ حالانکہ یہ اردو ہندی کے لسانی جھگڑے کو حل کرنے کا درمیان کا راستہ تھا اس کے حامی اس کو ناگری اور اردو دونوں رسم خط میں لکھنے کے حامی تھے۔ ہندوستانی اکیڈیمیاں بھی عرصہ تک قائم رہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستانی کی آواز ماند پڑ گئی گو آج بھی آسان ہندی اور آسان اردو کو ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ یہ نام بھی اردو کے لئے اپنے اندر کافی کشش رکھتا ہے۔

مسلمانی : اردو کا ایک پرانا نام جو کبھی علاقہ مدراس (تامل ناڈو) میں بولا جاتا تھا۔ یہ بھی میری نظروں میں موزوں ہے اگر ابتداء سے ہی جب اردو کو مسلمانوں کے سر زبردستی منڈھا گیا تھا اس کو اور مسلمانوں کو بدیشی بتایا گیا اگر اس کا نام مسلمانی رکھ دیا جاتا تو جس طرح ہندی نام سے ہندوؤں کو ایک قلبی نسبت

اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور تا ہنوز ہے۔ مسلمانی نام سے برصغیر کے ۲۰ کروڑ مسلمانوں کو بھی اس زبان سے ایک قلبی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔ بنگالی، مدراسی، آسامی، پنجابی، سندھی سب ہی اس کو اپنی زبان سمجھتے۔ اس سے اجنبیت نہ برتتے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی ایک مادری زبان مل جاتی

جیسے ہندو موجودہ ہندی زبان کو اپنی

مادری زبان اور مذہبی زبان سمجھتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے بقول سید سلیمان ندوی اپنی مذہبی زبان عربی اور ثقافتی زبان فارسی زبان کو اس زبان کے لئے قربان کر دیا۔ لیکن عجب مذاق ہے کہ یہ بھی اردو کو تنہا اپنی زبان نہیں کہہ سکتے۔ ہندو مسلمان سکھ سب کی زبان ہے اور دوسری اقوام بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں اگر اس صورت میں اسے مسلمانی نام دے دیا جائے تو ہندوستان پاکستان دونوں میں اس زبان کو مسلمانوں سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔ آزادی کے بعد ویسے بھی اردو مسلمان بننے لگی ہے۔ کیونکہ حکومت کے سہ لسانی اور دو لسانی فارمولوں کی بناء پر موجودہ غیر مسلم نسل اس کے رسم خط سے بالکل بے بہرہ ہو گئی ہے۔ اہل وطن کی یہی روش رہی تو اس کا یہ سکولرپن دس پندرہ سال میں بالکل ختم ہو جائے گا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں فرمایا "یہ امر واقعہ ہے کہ اس نسل کے بعد یوپی اور بہار کی سرزمین سے کوئی اہم غیر مسلم ادیب جنم نہیں لیگا۔

(ہماری زبان ۸ دسمبر)

لہ اردو نہ جاننے والے بنگالی و آسامی مسلمان اب بھی اسے نبی جی کی زبان کہتے ہیں کیونکہ بنگال اور آسام میں میلاد شریف ہمیشہ اردو میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ ہے مذہبی لگاؤ کا نتیجہ اگر اس کا نام مسلمانی ہوتا تو پورے برصغیر کے مسلمان اسے نوازتے۔ کنول

اردو کے مشہور ناول نگار پدم بھوشن قاضی عبدالستار ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرماتے ہیں :۔

"کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جوگیندر پال اور رام لعل کو بھول جائیے۔ آپ آپ کی زبان میں کوئی بلراج منیرا، سریندر پرکاش اور کوئی شرون کمار ورما پیدا نہیں ہوگا وہ غیر مسلم اردو داں طبقہ مرچکا جس کے بچے جوان ہو کر اردو کے ادیب بنتے تھے"

ان حالات میں جب مستقبل کی اردو صرف مسلم طبقہ کی اردو ہوگی تو اس کا پرانا نام مسلمانی رکھنے میں کیا حرج ہے۔

بھارتی :۔ میری نظر میں پرانے ناموں سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نام بھی ہے اور پیارا بھی ہے۔ زیادہ اہم بھی معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہے بھارتی ہندوستان کو بھارت ورش کہا جاتا ہے اور زیادہ تر سرکاری طور پر بھارت نام کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بھارت کی حدود پرانوں کے منتروں کے مطابق ہمالیہ سے راس کماری تک ہیں اور اس میں ہر قوم شامل ہے۔ اردو بھی ایک قومی زبان ہے۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن ہندوستان میں ہر فرد ہر قوم ہر صوبہ کے لوگ اسے آسانی سے سمجھ اور بول سکتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور اس کے بنانے میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا حصہ ہے جس پر میں پچھلے اوراق میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ کہا ہے۔ اس کا نام بھی وطن کی مطابقت سے ہونا چاہیے۔ جیسے کہ ہندی ہر ہندوستانی یا ہندوستانی کو اپنے نام کی مطابقت سے اپنے اندر ایک لسانی کشش رکھتی ہے۔ بھارتی نام اس کا بدل ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے نام کی اجنبیت کو دور کر سکتا ہے۔

میری نظر میں اردو کے لئے جو جو اہم نام اس کی بہبودی کو مد نظر رکھتے

ہو سکتے تھے وہ مندرجہ بالا سطور میں پیش کر دیئے ہیں کیونکہ لوگ مجھ سے سوال
کرتے تھے کہ جب آپ نے ایک مسئلہ چھیڑا ہے تو اپنی رائے بھی پیش کردیں۔
حقیقت میں میں اپنی معمولی ادبی حیثیت اور علمی کم مائیگی کی وجہ سے اس موضوع
کو پیش کرتے ہوئے بھی ایک ذہنی ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ اس لئے یہ
کام ارباب اہل ادب کا ہے اگر میری باتوں میں کچھ وزن ہے تو اس مسئلہ پر غور
کریں اور کوئی عملی قدم اٹھائیں۔ ہم کافی وقت اپنی بے حسی کی وجہ سے کھو چکے ہیں
اب بھی اگر کچھ عملی قدم نہ اٹھایا گیا تو یہ اردو کی موجودہ تابوت میں ایک نئی کیل
ٹھوکنے کے مترادف ہوگا۔

مانیں نہ مانیں آپ کو یہ اختیار ہے + ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں
آخر میں ایک گزارش اور کروں گا کہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنی رائے
چاہے وہ مثبت ہو یا منفی کا ضرور اظہار فرمائیں۔

خادم اردو
کنول ڈبائیوی
شعبۂ اردو۔ کے آئی کالج
قصبہ ڈبائی بلند شہر

کتاب کا آخری باب

مراسلات وجوابات

جو اُردو زبان کا نام تبدیل کرنے کے سلسلے میں ۱۵؍اپریل ۱۹۷۴ء
تاغایت ۲۲؍جنوری ۱۹۷۵ء تک ہفتہ وار ہماری زبان دہلی میں
مصنف اور دوسرے افراد کی جانب سے شائع کرائے گئے۔

فہرست

انجمن ترقی اُردو کا ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" دہلی میں ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء کو
شائع ہونے والا میرا پہلا خط

اُردو کے نام کی تبدیلی کی ضرورت

ایک ٹیچر ہونے کی حیثیت سے متعلقہ حلقوں کے اساتذہ اور طلباء کے نقطۂ نظر سے واقف ہونے کی بنا پر میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ ہندی کے متعصب حامیوں کو اُردو کے غیر ہندوستانی نام سے بھی خدا کے واسطے کا بیر ہے۔ اگر بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اُردو کو کسی مانوس ہندوستانی نام سے موسوم کر دیا جائے تو میرے خیال میں رہی سہی مخالفت کا بھی ازالہ ہو کر اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا ہے اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فوج یا لشکر یا شاہی چھاؤنی کے ہیں۔ چونکہ ابتدائی دور میں اُردو نے فوج کی ملی جلی چھاؤنیوں میں نشو و نما پائی اس لئے اس کا نام بھی اردو مشہور ہو گیا اب یہ زبان ترقی کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے صرف لشکری زبان نہیں بلکہ عوامی زبان بن جانے کا منصب حاصل ہو گیا ہے اس لئے اس کے نام میں بھی وسعت اور ملکی رنگ کی جھلک ہونی چاہیئے۔ اس طرح دوسری زبان والوں کو اس نام میں جو اجنبیت محسوس ہوتی ہے وہ بھی باقی نہیں رہے گی۔ اب یہ اُردو کے اہل علم اور فاضل محققین کا کام ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا موزوں ہندوستانی نام تجویز

کریں جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔

ابتدائی دور میں اُردو کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ کبھی اس کو ہندی کہا گیا کبھی ہندوی اور کبھی ریختہ اردو بہت بعد کا نام ہے۔ ہندی اردو کے لسانی نزاع کے زمانے میں آسانی اور سلیس اُردو کو ہندوستانی کا نام دیا گیا ایک بات میں اور واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اردو کی موجودہ رسم خط کی تبدیلی زبان کے لئے سمِ قاتل ہوتی ہے۔ اُردو کے حروف تہجی دنیا بھر کی زبانوں کے حروف کے تلفظ کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی زبان ادائگی تلفظ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہاں ٹائپ اور طباعت کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اُردو کے رسمِ خط میں کچھ رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میرے اس خیال سے اہلِ علم اردو دوست متفق نہ ہوں اور میرا مضحکہ اڑائیں۔ لیکن اردو سے محبت اور وابستگی نے ہی مجھے اس رائے کے اظہار پر مجبور کیا ہے۔ (کنول ڈبائیوی)

اس خط کا ردِعمل ہونا ضروری تھا وہ ہماری زبان کے قابل نائب مدیر محترم جناب سید تفضل حسین صاحب نائب مدیر نے ۱۵ مئی ۱۹۷۴ء کے ہماری زبان کا اداریہ اسی موضوع پر تحریر کیا جس کی نقل پیشِ خدمت ہے۔

اُردو کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں

۱۵ اپریل کے ہماری زبان میں کنول ڈبائیوی صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں مشورہ دیا گیا ہے کہ تنگ نظر فرقہ پرستوں کی زبان بندی کے لئے اردو کا نام بدل کر ہندوستانی رکھ دیا جائے تو اُردو کے حق میں فضا اور زیادہ سازگار ہو سکتی ہے۔ ہماری زبان میں ہر اردو دوست کو اردو سے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایڈیٹر کو بھی ان خیالات سے اتفاق ہو۔

جہاں تک مراسلہ نگار کی اُردو سے محبت اور وابستگی کا تعلق ہے ہمیں ان کی نیت پر شک وشبہ کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی لیکن انھوں نے فرقہ پرستوں سے مرعوب ہو کر اُردو کے نام میں تبدیلی کا جو مشورہ دیا ہے۔ اس میں احساس کمتری اور شکست خوردگی کے آثار نظر آتے ہیں اور اردو کے حق میں یہ اچھی علامت نہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا برسہا برس سے زبان پر چڑھے ہوئے اردو کے پیدائشی نام میں تبدیلی کی ضرورت اب کیوں پیش آرہی ہے شاید یہ غلط ماحول سے متاثر اور مرعوب ہونے کا نتیجہ ہو ایک زمانہ وہ تھا جب چاروں طرف سے اردو پر یلغار ہو رہی تھی اور اسے غیر ملکی قرار دے کر جلاوطن کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ سرکاری دفاتر اور مدارس سے اُردو کو حرف غلط کی طرح مٹایا جا رہا تھا اردو کی حمایت کرنا فرقہ پرستی اور وطن دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا ایسے نازک وقت میں ہم نہیں گھبرائے تو اب مایوس اور بد دل ہونے کی کیا وجہ ہے اب تو زمانے نے کچھ پلٹا کھایا ہے۔ اُردو کے حق میں بڑی حد تک فضا سازگار ہوتی جارہی ہے سرکار و عوام کو اس کی اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے کٹر سے کٹر مخالف بھی حقیقت حال سے مجبور ہو کر اسے مشترکہ ہندوستانی زبان کہنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ وقت ہمت اور اولوالعزمی کے ساتھ اُردو کے جائز حقوق کو منوانے کا ہے نہ کہ مایوسی و بد دل ہو کر ہتھیار ڈالنے کا۔

قومی زبان ہونے کے ناطے اردو سے ملے جلے کلچر و تہذیب کی نشانی ہے۔ مختلف فرقوں اور جاتیوں کے باہمی میل ملاپ کی پیداوار ہے۔ اگر کسی زمانہ میں فوج کے اندر مختلف اللسان گروہوں میں باہمی تبادلۂ خیال کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے اس کا نام اُردو پڑ گیا تو کیا غضب ہو گیا مدت تک اردوئے معلّٰی کے نام سے یہ لفظ قومی تہذیب کا آئینہ بردار ہو رہا ہے اردو ترکی زبان کا لفظ سہی مگر جب سے وہ اس ملی جلی زبان ہندوستانی زبان

سے منسوب ہوا ہے ہندوستانی لفظ بن گیا ہے۔ اس نام سے ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور پال پوس کر پروان چڑھایا ہے اس کا تعلق صدیوں کی روایات سے وابستہ ہے۔ اب اس سے نفرت کیوں؟ یہ گھناؤنی فرقہ پرستی ہے۔ ہمیں نہ تو اس سے مرعوب ہونا چاہئے اور نہ شرم و ندامت سے سر جھکانے کی ضرورت ہے۔

اردو میں ہزاروں غیر ملکی الفاظ کثرت استعمال سے بجنسہ یا کچھ رد و بدل کے ساتھ خود اردو بن گئے ہیں اور زیادہ تر انھیں الفاظ پر اردو کے حسن و شائستگی شیرینی و شگفتگی کا انحصار ہے۔ اگر مراسلہ نگار کے مشورہ کو ذرا بھی قابل اعتنا سمجھا گیا تو اس قیمتی ذخیرہ الفاظ سے بھی اردو کو ہاتھ دھونا پڑے۔ اور یہی سلسلہ جاری رہا تو کیا تعجب ہے کہ آگے چل کر رسم الخط کو بھی خیرباد کرنے کے مشورے دیئے جانے لگیں گے دنیا کی کسی بھی زبان کو غیر ملکی الفاظ سے مفر نہیں زبانوں کی ترقی اور ارتقا کی منزلیں باہمی اشتراک و تعاون سے ہی طے ہوتی ہیں اس لین دین کے عمل سے زبان میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے جو زبان اپنے خول سے باہر نہیں نکلتی وہ آخر کار مردہ قرار پاتی ہے۔ ۲۶-۲۷ سال سے ہندی کو سنسکرت آمیز بنایا جارہا ہے۔ مگر آج تک اس کو عوامی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اصل ہندی میں سنیکڑوں الفاظ مستعار لئے گئے ہیں جو خود ہندو ہندی اور ہندوستانی کس زبان کے الفاظ ہیں۔ یقیناً یہ ہندی کے الفاظ نہیں بلکہ اردو کی دین ہیں اگر ان کو خارج کر دیا جائے تو ہندی زبان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اردو کسی ایک فرقہ کی ملکیت نہیں سب ہندوستانیوں کا قیمتی سرمایہ ہے اس زبان کے سینکڑوں ادیب و شاعر مورخ اور دھرم پرچارک گذرے ہیں اور اب بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جنھوں نے اس زبان کو بنانے اور سنوارنے میں مسلمانوں سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ اگر ان کے عمر بھر کے سرمایہ کو ان سے چھین دیا

جائے اور اُن کے فارسی عربی تخلص اور قلمی ناموں سے ان کو محروم کر دیا جائے تو ان کو محروم کر دیا جائے تو ان کے دل پر کیا گذرے گی۔

حال ہی میں لکھنؤ میں غیر مسلم ادیبوں کی کانفرنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ انھیں اپنے اس قیمتی ورثہ کی تحفظ کی فکر ہے۔ ایسے اُمید افزا حالات میں یہ وحشت اور دہشت کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں کا شبہ پیدا کرتی ہے۔ بہرحال مراسلہ نگار کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اگر وہ اردو کے سچے بہی خواہ ہیں تو احساس کمتری کو خیرباد کہہ کر میدان میں آئیں اور تاریخی شواہد اور دلائل و براہین سے کام لے کر مخالفوں کی غلط فہمیوں کو رفع کریں گے اور اس طرح اردو کی فضا کو زیادہ سازگار بنانے کا طریقہ اختیار کریں۔

آخر میں ہم بلا جھجک یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اُردو اردو ہی رہے گی اور اسی نام سے ترقی کی منزلیں طے کر کے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوگی۔

سید تفضل حسین

جوابی مراسلہ ۱۵ رمئی ۱۹۷۲ء

اُردو کے نام تبدیلی کی ضرورت کیوں؟

ہماری زبان کے ۱۵ اپریل کے شمارہ میں جناب کنول ڈبائیوی نے ایک مراسلہ کے ذریعہ یہ مشورہ دیا ہے کہ اردو کا کوئی ایسا نام رکھ دیا جائے جو سب کے لئے قابل قبول ہو موصوف کا خیال ہے کہ چوں کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اور ہندی کے متعصب حامیوں کو اس کے غیر

ہندوستانی نام سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس لئے دوسری زبان والوں کو اس سلسلے میں جو اجنبیت محسوس ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہے گی یہ کیا منطق ہے اگر اردو ترکی زبان کا لفظ ہے تو کون ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آخر دنیا کی کونسی ایسی زبان ہے جس میں لسانی اختلاط نہیں۔ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ محدود نہیں ہونا چاہیئے ہمیں ہمیشہ آفاقی نقطۂ نگاہ کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ اگر کچھ تنگ دل اور بدنہاد لوگ اُردو کے نام سے چڑھتے ہیں تو اُن کی خاطر ہم کیوں اپنا اصول بدلیں۔ ہم احساس کمتری کے شکار کیوں ہوں۔

جناب ڈبائیوی صاحب نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اگر آسان اور سلیس اُردو کو ہندوستانی کا نام دیا گیا تو یہ ان کے خیال سے موزوں اور مناسب رہے گا لیکن میں جناب موصوف سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے تو ہندی کس زبان کا لفظ ہے اور ہندوستانی کی ترکیب کس زبان کی مرہون منت ہے اور پھر اس بناء پر کہ اردو ترکی کا لفظ ہے اسے کوئی دوسرا نام دے دینا چاہیئے تو اس زبان کے ان تمام الفاظ کو کیوں نہ خارج کر دیا جائے تو فارسی ترکی عربی اور انگریزی سے لئے گئے ہیں۔ صرف اردو کے نام بدلنے سے کیا فرق پڑے گا۔ غالبؔ میرؔ مومنؔ سوداؔ آتشؔ ناسخؔ شادؔ اقبالؔ فراقؔ جوشؔ جمیلؔ اور عقیلؔ کے ناموں کو کیوں چھوڑ دیا جائے یہ تو بدیسی زبان کے الفاظ میں اور پھر ہندی یہ بھی فارسی کی ترکیب ہے اسے بھی کیوں نہ بدل دیا جائے بہر کیف جیسا کہ خود کنول ڈبائیوی صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اس خوف کا اظہار کیا ہے کہ اردو دنیا اُن کے اس خیال کا مذاق اڑائے گی: میں اُن کا مذاق تو نہیں اڑانا چاہتا لیکن میں کسی طرح ابھی اس کی بے بنیاد رائے کا قابل قبول نہیں سمجھتا۔ اردو ہمیشہ اردو رہےگی

اور وہ اسی نام سے ساری دنیا میں جانی اور پہچانی جائے گی۔

قیصر عثمانی صدر انجمن ترقی اردو ملاڈ بمبئی

"اُردو کا نام بدلنا ضروری ہے"

مراسلہ یکم جون ۱۹۷۴ء

میرا خط ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء کے ہماری زبان میں شائع ہوا تھا دو اصحاب نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے حقائق پر توجہ دینے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ ہندی، ہندو، ہندوستان کی ذہنیت نے انیسویں صدی کے آخر سے ہی اُردو کو جو نقصان پہنچایا ان میں پنجابی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ لوگ پنجابی کے مقابلہ میں اردو کی کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ اُردو کا طبقہ پنجاب میں زیادہ ہے لیکن آزادی کے بعد کی نسل اُردو سے بہت کم واقف ہے انھوں نے سہ لسانی[1] فارمولے کے ہوتے ہوئے بھی پنجابی کے بعد اردو کے مقابلہ میں سنسکرت کو اپنایا ہے۔ زبان کے وطنی نام کا ہر شہری پر اثر پڑتا ہے۔ حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض نے اردو کے مقابلہ میں پنجابی کی حمایت کی۔ بنگلہ دیشی

---

[1] مجھے اس وقت تک اس بات کا علم نہ تھا کہ پنجاب میں سہ لسانی فارمولے میں اردو کا مقابلہ پنجابی اور انگریزی سے ہے یعنی اس کو یوپی کی طرح سمجھتا تھا۔ یوپی میں اردو کے علاوہ اختیاری مضامین سنسکرت اور انگریزی ہیں اور ان میں سے دو مضمون لینے پڑتے ہیں۔

میں جو کبھی مشرقی پاکستان کہلاتا تھا سب سے پہلے اردو کی مخالفت ہوئی۔ ڈر ہے کہ اگر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو اردو مسلمانوں کے خاص طبقے کی زبان ہو کر رہ جائے گی چالیس پچاس سال بعد اردو ہندوستان میں وہی پوزیشن ہوگی جو آجکل فارسی کی ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اردو کا نام بدل کر اسے بچا سکتے ہیں تو قیمت زیادہ نہیں۔

کنول ڈبائیوی

جوابی مراسلہ ۸ جون ۱۹۷۲ء

اُردو کا نام بدلنے کی ضرورت

محترمی اُردو کا نام بدلنے کے سلسلے میں کنول صاحب کا مراسلہ ۱۵ اپریل کے ہماری زبان میں نظر سے گذرا کنول صاحب کا خیال کسی حد تک درست ہے کیونکہ اس زبان کا موجودہ نام اُردو کبھی کوئی پہلا نام نہیں۔ البتہ پرانا ضرور ہے۔ موجودہ نام شاہجہاں کے عہد سے شروع ہوا اس نام سے قبل ریختہ، اُردوئے معلیٰ زبانِ ہندی برج بھاشا وغیرہ ناموں سے اس زبان کو پکارا جاتا تھا۔ امیر خسرو ملا وجہی وغیرہ نے اس زبان کو زبان ہندی کہا ہے تمام اُن اشخاص کو جو اُردو سے محبت کرتے ہیں اس بات کو غور سے سوچنا چاہیئے اُردو کا نام تبدیل کرنے سے اس زبان کو فائدہ ہوگا یا نقصان جہاں اس زبان نے اتنے رنگ بدلے ہیں وہاں اگر ایک رنگ اور تبدیل کرے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا نام تبدیل کر کے بھارتی سانچہ میں ڈھال دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

ناصر محمود

جوابی مراسلہ ۸ر جون ۱۹۷۴ء

۱۵ر اپریل کے ہماری زبان میں ڈاکٹر کنول ڈبائیوی صاحب کا ایک خط اُردو زبان کا نام بدلنے کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ ۱۵ر مئی کے شمارہ میں اس کے خلاف بھی لکھا گیا۔ اصل میں اُردو زبان عوامی پراکرتی جو اس ملک میں ہزاروں سال سے بولی اور سمجھی جاتی تھی کی ایک صاف ستھری اور سنوری ہوئی تصویر ہے جس کے وقت کے ساتھ ساتھ کئی نام رہے ہیں۔ شاہجہاں نے اس کو اردوئے معلیٰ کا نام دیا اور بعد میں اردو کہلانے لگی۔ انگریزوں نے فارسی کی جگہ کسی دیسی زبان کو رابطے کی زبان بنانا چاہا تو اردو کو چنا کیونکہ اس دور میں فارسی عربی کی تعلیم ہندوستانی شرفاء اور اونچے طبقے میں رائج تھی۔ اس لئے ہندو مسلمان دونوں نے اُردو کو اپنایا لیکن انگریزی دور شروع ہونے پر جب قوم پرستی کا جذبہ اُبھرا تو ہندوؤں کے ایک خاص طبقے نے اردو کی مخالفت میں فارسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری ہی خط کا استعمال کیا اور اس بولی میں سے جسے لوگ اُردو کے نام سے پکارتے ہیں عربی فارسی کے الفاظ نکال کر سنسکرت کے غیر معروف الفاظ بھرنے شروع کر دیئے اور ملک میں سمجھی جانے والی زبانیں اس وقت تک چاہے وہ کھڑی بولی ہو یا برج بھاشا یا ہریانی یا توجی یا بندیلی رکھا حالانکہ ہندی بھی ایک فارسی لفظ ہے اُسے نہیں نکالا گیا بلکہ اپنا فائدہ اٹھانے کے لئے اس کو اپنا لیا اور آج تک اس نام سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ خسرو سے غالب تک کے زمانہ میں اُردو کو ہندی کہتے تھے اور اب بھی اس وجہ سے اُردو کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ارباب ادب نے بھی اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا آج ملک کے وہ حضرات جو ہر وقت گھر اور باہر اردو ہی بولتے ہیں لیکن اسے کہتے ہندی ہیں۔ ہندی لیڈر اردو تقریر کو ہندی کہتے ہیں۔ میری رائے میں ارباب فن کو ڈاکٹر کنول کی تجویز پر غور کرنا

چاہیئے اور سب پہلوؤں سے جانچنا چاہیئے اگر مفید ہو تو اس پر عمل کریں اور اس کا نام ہندوستانی یا ہندوی رکھدیں۔

یادکرن یاد دہلوی
۹۱/ڈ نیو گوبند نگر

اُردو کے نام کی تبدیلی کی ضرورت کیوں

جوابی مراسلہ ۲۲ر جون ۱۹۷۴ء

محترم ۸ر جون کے ہماری زبان میں یاد صاحب کا ایک مراسلہ اردو کا نام بدلنے کے سلسلے میں نظر سے گذرا میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کا نام بدلنے کا اُن میں جو جذبہ کارفرما ہے اس کی بنیاد احساس کمتری پر مبنی ہے۔ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں یہ اُن سب کی زبان ہے جو ہندوستان میں رہتے ہیں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یادکرن یاد نے اپنے مراسلہ میں لکھا ہے کہ خسرو سے لے کر غالب تک اُردو کو ہندی کہنے سے کافی نقصان پہنچا جو غلط ہے فلم غالب کو اُردو فلم ہونے سے کون باشعور ہندوستانی انکار کر سکتا ہے مگر جب اسے سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے تو ہندی کا اردو کا نام نئی ہندی رکھنا مناسب ہے نہ ہندوستانی اُردو سے جو تعصب پھیلا ہوا ہے اس میں اُردو کا قصور نہیں بلکہ اس کی مخالفت کی ذمہ داری اردو کے ان نادان دوستوں پر ہے جن سے اسے نقصان پہنچا اس لئے اُردو کا نام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

احمد علی شاہجہاں پور

جوابی مراسلہ ۱۵ر جولائی

اُردو کا نام بدلنا ضروری نہیں

محترمی۔ ہماری زبان یکم جون ۱۹۷۴ء کے صفحہ ۵ پر کنول ڈبائیوی کا ایک مراسلہ بعنوان "اُردو کا نام بدلنا ضروری ہے" شائع ہوا ہے جس میں درجِ ذیل سطور بھی شامل ہیں" پنجابی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اہلِ پنجاب پنجابی کے مقابلہ میں اردو کی کوئی اہمیت نہیں دیتے حالانکہ اردو داں طبقہ پنجاب میں زیادہ ہے۔ لیکن آزادی کے بعد کی نسل بہت کم اُردو سے واقف ہے۔ انھوں نے سہ لسانی فارمولے کے ہوتے ہوئے بھی پنجابی کے بعد اردو کے مقابلہ میں سنسکرت کو اپنایا ہے" مراسلہ ہذا کی عبارت آرائی سے قطع نظر صاحبِ مراسلہ نے حالات و حقائق دونوں سے عدم واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ پنجاب میں سہ لسانی فارمولا کے تحت اردو کی جگہ سنسکرت کو اپنانے کی بات نہ صرف سراسر خلاف واقعہ ہے بلکہ ایسی صورت حال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا غالباً مراسلہ نگار صاحب نے یہ سطور لکھتے وقت سہ لسانی فارمولا کی حقیقت پر غور نہیں فرمایا کیونکہ سہ لسانی فارمولا کے تحت تیسری زبان کے طور پر اردو سنسکرت (وغیرہ) کی گنجائش ہندی ریاستوں میں ہی نکل سکتی ہے جہاں اول زبان ہندی دوسری انگریزی اور تیسری کسی ایک جدید زبان (اردو دیگر) کی تعلیم مقصود ہے۔ پنجاب چونکہ ایک غیر ہندی ریاست ہے یہاں اول زبان کے طور پر پنجابی دوسری ہندی اور سوم انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔

پنجابی کے مقابلہ پر اُردو کو اہمیت نہ دینے کی بات کہنا بھی درست ہے اگر کسی کا منشا یہ ہے کہ پنجاب میں اُردو کو پنجابی پر ترجیح دی جانی چاہیئے۔ یا پنجابی کو بالکل نظرانداز کر کے اس کی جگہ اردو کو دی جانی تو ایسی رائے کا اظہار کرنے والے کی خدمت میں بھی عرض کیا جا سکتا ہے، جو چاہیئے

آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" اپنی مادری زبان سے محبت کرنا کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ البتہ اپنی زبان کے علاوہ دیگر زبانوں سے نفرت کرنا تعصب و تنگ نظری کی دلیل اور یقیناً قابلِ اعتراض ہی نہیں لائق مذمت میرے نزدیک مراسلہ نگار کی طرف سے حفیظ اور فیض کا نام بلا ضرورت لایا گیا ہے لیکن اگر ان حضرات نے اُردو کی مخالفت کے بغیر پنجابی کی حمایت یا وکالت کی ہے تو ان کا یہ فعل ہرگز قابلِ گرفت نہیں۔ البتہ اگر وہ پنجابی کی حمایت کے ساتھ اُردو کی مخالفت کرتے ہیں تو ہر معقول اور انصاف پسند کے نزدیک لائق مذمت ہیں۔ رہی یہ بات کہ اُردو کا نام تبدیل کرنے کی اگرچہ اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن میں فی الحال صرف یہی عرض کروں گا کہ اس لاحاصل بحث سے اردو کو تو نہیں اُردو کے مخالفین کو تو ضرور فائدہ پہنچ سکتا ہے لہٰذا اگر اس بحث کو طول ہی نہ دیا جائے تو بہتر ہے۔

سورج تنویر حیدری گڑھ

مراسلہ یکم نومبر ۷۴ء

کچھ اُردو کے نام بدلنے کے بارے میں

محترمی ۱۵ اپریل اور ۱۵ مئی کو میرے مختصر مراسلے ہماری زبان میں شائع ہوئے تھے کئی صاحب نے ان کی موافقت اور کئی نے مخالفت میں کچھ لکھا محترم وینڈیر شاد سکسینہ نے بھی مجھے خفگی کا خط لکھا۔ لیکن حقائق پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھا کہ میں

حکومت یا فرقہ پرستوں کا آلۂ کار ہوں اور اسی لئے اُردو کا نام بدلنا چاہتا ہوں
جیسے کہ میرے کہنے سے نام بدل جائے گا۔ خیر مجھے یہ دشنام طرازیاں قبول
نہیں ہیں ۔ اردو کا بھی خواہ ہوں اور اس کو ہندوستان میں سرسبز و شاداب
دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کئی جگہ اس کا اچھا ردّ عمل بھی ہوا ۔ مختلف اخبار اور
رسائل میں اس پر اس موضوع سے ملتے جلتے مضامین بھی شائع ہوئے۔ ۱۲ اگست
کے ہندی روزنامہ ویر ارجن میں جہاں نریندر نے بھی ایک اداریہ اردو
کے راشٹریہ کرن کے نام سے تحریر فرمایا مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ
راشٹریہ کرن کی ضرورت ہندی کو ہے تاکہ اردو کو اگر ہندی کو عوامی زبان بنانا
ہے تو اسے وقت کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا۔ جب پرانے لباس تک کو
آج کی نسل قریب قریب ترک کر چکی ہیں تو پرانی روش کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔
عوام پر کوئی زبان ٹھونسی نہیں جا سکتی۔ نریندر صاحب نے یہ اداریہ فاؤنٹین
پین سے میز کرسی پر بیٹھ کر لکھا ہوگا۔ یہ چیزیں بھی ودیشی ہیں وہ زبان کو
کی چٹائی پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ آج اپنی زندگی کے روزمرہ میں ہر جدید چیز کا
استعمال کرتے ہیں۔ کوٹ پتلون چائے سگریٹ معمولی معمولی اشیاء کے نام
آپ کہاں تک بدلیں گے ۔ آج کی ہندی کو دیسی ہندی بننا پڑے گا جو اب سے
ڈیڑھ سو سال پہلے تھی اور ہندو مسلمان اپنے اپنے رسم الخط میں تحریر کیا کرتے
تھے ۔ خیر یہ موضوع ہی الگ ہے ۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ اردو عوامی زبان
ہے اور صدیوں میں مختلف قوموں کے میل جول سے بنی ہے

اور اس کے ہر دور میں مختلف
نام رہے ہیں۔ امیر خسرو سے غالب تک یہ قریب ایک درجن مختلف ناموں
سے پکاری گئی ہے لیکن زیادہ تر اسے ہندی یا ہندوستانی کہا گیا ہے اور

موجودہ ہندی انگریزوں کا عطیہ ہے جو انھوں نے پھوٹ ڈالو، حکومت کرو کی پالیسی کے پیش نظر کلکتہ میں تیار کرائی۔ موضوع کی موافقت میں میرے پاس کافی مواد موجود ہے لیکن جگہ کی تنگی کے خیال سے مضمون میں اختصار کو بھی مدنظر رکھنا پڑا ہے۔

اردو کے ماضی میں نام کے سلسلے میں دو ایک مثالیں پیش کروں گا۔ امیر خسرو اور دوسرے صوفیائے کرام نے اسے ہندی کہا گل کرسٹ اور دوسرے انگریز مصنفین نے اسے ہندوستان کا نام دیا۔ مولانا عبدالحق "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"، میں شیخ حمید ناگوری کے سرور الصدور صفحہ ۲۲۰ کی عبارت کا حوالہ دے کر تحریر فرماتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بزرگوں کے گھروں میں ہندی بولی کا رواج تھا اور چونکہ یہ ان کا مفید مطلب تھا اس لئے وہ اپنی تعلیم و تلقین میں اسی زبان کو استعمال کرتے تھے اور جو باوجود تغیر و تبدل کے کچھ مدت قبل تک ہندی کہلاتی رہی۔ اور اب اردو کے نام سے موسوم ہے۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام،

زبان ہندی پرس تا نغز گویم
چو من طوطی اندر است پرستی

(خسرو)

"مختلف دور میں اردو کے مختلف نام رکھے گئے۔ منجملہ کبھی ہندی کہا گیا کبھی ہندوی" مختصر تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۱ مصنف ڈاکٹر اعجاز حسین۔

ابتدائی دور میں اردو کو ہندی، ہندوی، ریختہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو کے نام کے بارے میں دو تین مستند مثالیں پیش کر چکا ہوں کہ انیسویں صدی سے پہلے اردو کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف

تھے مرزا غالب اپنے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کے نام لکھتے ہوئے کہتے ہیں میرا حال اس فن میں یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار بھول گیا ہوں مگر ہاں ہندی کلام میں ڈیڑھ شعر ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے ۔

مصنف جائزہ تاریخ اردو مصنف شرافت حسین مرزا ایم اے میں اس موضوع کو مزید طول نہ دے کر صرف دو رائے اور پیش کروں گا ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی تعارف تاریخ اردو ایڈیشن کے صلا۲۹ پر اردو کے مختلف ناموں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں له اندوستانی قدیم انگریز مورخین نے ہندوستان کے حالات لکھنے کے سلسلے میں اردو کو لفظ اندوستانی سے تعبیر کیا ہے ۲ مورز بعض انگریز مورخوں نے اردو کو مورز کے نام سے یاد کیا ہے ۳ لینگوا اندوستانی اٹھارہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں لاطینی مصنفین نے اردو کو لنیگوا اندوستانی کا نام دیا ہے ۴ ۱۶۱۶ء (الف) مسٹر ٹیری نے اردو کو ہندوستانی لکھا ہے (ب) ۱۷۹۰ء میں جان گل کرسٹ نے اردو کے لئے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے (ج) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی اردو کو ہندوستانی تحریر کہا گیا ہے ۔ ڈنکن فاربس نے اپنی اردو قواعد کا نام ہندوستانی گرامر لکھا ہے ۵ ہندی صوفیائے کرام اور علمائے اردو کا نام ہندی لکھا ہے ۔ شاہ رفیع الدین نے قرآن پاک کا ترجمہ بہ ترجمہ ہندی کے نام سے کیا ۔ ایک زمانے تک اردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال ہوتا تھا ۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

۶ ریختہ متقدمین سے لے کر غالب تک اردو کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا ۔ میر کہتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

غالب کہتے ہیں ؂

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

؎ اردوئے معلی شہنشاہ شاہ جہاں نے جب شاہ جہاں آباد کیا اور جامع مسجد شہر پناہ وغیرہ عمارتیں تعمیر کرائیں تو بازار کا نام اردوئے معلی رکھا۔ اردو کے لغوی معنی امراء کے سلاطین کے فرودگاہ کے ہیں۔ چونکہ مخلوط زبان شاہی کیمپ میں بولی جاتی تھی۔ اس لئے اسکا نام بھی اردوئے معلی رکھا گیا۔

؎ اور انیسویں صدی ہی میں ریختہ اور اردوئے معلی کے بجائے اردو لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا۔ اپریل گرنٹ ۱۸۰۸ء میں اس زبان کے لئے صرف اردو لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس سے قبل مصحفی نے بھی اردو لفظ استعمال کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے صـ ۲۹

ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو موجودہ ہندی کے معمار اور اردو کو بھی نئی زندگی بخشنے والے کہتے جاتے ہیں ہائیڈل برگ برمنی کی لائبریری میں ملنے والے "نثر بے نظیر" کے مخطوطے کے حاشیہ پر لکھے ہیں۔ ان الفاظ کو ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے الفاظ میں سنئے۔

"یہ مخطوطہ اصل میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا نثری ادب ہے۔ اس کے ابتدائی تعارفی کلمات میں یہ جملہ قابل غور ہے"

جان گلکرسٹ[1] نے کس لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ گفتگو میں اردو کے لوگ ہندو مسلمان مرد لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو"۔

ڈاکٹر موصوف اس پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

اس جملے سے کم از کم چار باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کا نام اس دور میں ہندوستانی (یا ہندوی یا ہندی) تھا
۲۔ اردو لفظ لشکر یا شہری آبادی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔
۳۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندو مسلمان دونوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔
۴۔ یہ زبان گفتگو کی زبان تھی اور اس کا چلن محض کتابی یا دفتری نہ تھا۔ قارئین سمجھ چکے ہوں گے کہ موجودہ اردو اپنی ابتداء میں مختلف ناموں سے کہی جاتی تھی۔ اب یہ کام ارباب ادب کا ہے کہ اگر اردو کا نام بدلنے سے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو اس موضوع پر غور کرنا چاہیئے اور اس میں ہرج ہی کیا ہے جب کہ ماضی میں اس کے ایک درجن کے قریب نام رہ چکے ہیں۔ کنول ڈبائیوی

[1] یہ جملہ ہوبہو انہیں الفاظ میں باغ و بہار کے دیباچہ میں بھی موجود ہے۔

جوابی مراسلہ ۲۲ر نومبر ۷۴ء

"اردو کا نام"

"ہماری زبان یکم نومبر ۷۴ء افکار و مسائل کے آخری پیراگراف میں کنول ڈبائیوی صاحب رقمطراز ہیں موجودہ اردو اپنی ابتدا میں مختلف ناموں سے کہی جاتی تھی۔ اب یہ کام ارباب ادب کا ہے کہ اردو کا نام بدلنے سے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو انھیں اس موضوع پر غور کرنا چاہیئے اور اس میں ہرج ہی کیا ہے جب کہ ماضی میں

اس ایک درجن کے قریب نام رہ چکے ہیں۔ ارباب ادب کی آڑ میں کنول صاحب کے دل کی بات زبان پہ آ ہی گئی۔ میں کنول صاحب اس قسم کی تحریک چلانے والوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا لفظ اُردو سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے کیا لفظِ اُردو ذہن پہ بار گراں معلوم ہوتا ہے۔ اُردو کا نام بدلنے سے آخر اُردو کو کس قدر فیض پہنچ سکتا ہے ذرا اس کی وضاحت تو کیجئے اور اگر نام نہ بدلا گیا تو اردو پہ آسمان ٹوٹ پڑے گا ہندی کے بارے میں کبھی کسی نے ایسا کیوں نہیں سوچا جب کہ ہندی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا بعض حضرات کے دماغوں میں اُردو کا نام بدلنے کا کیڑا کیوں کلبلاتا ہے۔ اُردو کا بڑا ہلکا پھلکا اور پیارا لفظ میں اردو کی ابتدائی تاریخ موجود ہے اس لحاظ سے یہ نام اور زیادہ قابل قدر اور قابلِ فخر ہے۔ اردو زبان کا نام اُردو ہی رہنا چاہیئے۔ ارباب ادب غور فرمائیں کہ اردو کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں کہیں بنگلہ دیش جیسی سیاست تو کارفرما نہیں:

عبدالستار نینی تال

جوابی مراسلہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء

محترمی! یکم نومبر ۱۹۷۴ء کے ہماری زبان میں کنول ڈبائیوی صاحب کا مراسلہ دیکھا اس سے قبل بھی کنول ڈبائیوی صاحب کا مراسلہ اور اس کے رد عمل کے طور پر چند دوسرے لوگوں کے مراسلے پڑھنے کو

ے کنول ڈبائیوی صاحب نے اُردو زبان کا نام بدلنے کے بارے میں کہا ہے
تو اس سلسلے میں چند باتیں یہ کہنی ہیں کہ کنول ڈبائیوی نے تو صرف نام بدلنے
کے بارے میں کہا ہے لیکن مراسلہ نگار شاید اس بات کو بھی بھول گئے کہ
اردو ہند کے علاوہ بھی کہیں اور بولی جاتی ہے۔ ہند کے علاوہ جب اردو
دوسرے ممالک میں بھی پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ تب یہ ضروری تو نہیں کہ جب
ہم ہند میں اس کا نام بدل دیں گے تو دوسرے ممالک والے بھی اسے تسلیم کر
لیں گے۔ اگر غیر ممالک نے اسے تسلیم نہ کیا تو ایک ہی زبان کے ساتھ کتنا بڑا
المیہ ہوگا۔ ایک جگہ کچھ اور نام سے پکاری جائے گی اور دوسری جگہ کچھ اور سے
یہ تو پاکستان کا بٹوارہ ہو گیا کہ ایک حصہ اس کو دا اور دوسرا اس کو نہ۔

دوسری بات جس کے لئے مراسلہ نگار کی غلط فہمی کو دور کرانا چاہتا ہوں
وہ ہے اُردو زبان کے لئے ہندی یا ہندوستانی کا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مراسلہ نگار
کم از کم راہی معصوم رضا اور اُن کی طرح کے دوسرے وہ لوگ جو اردو رسم الخط
بدلنے کی بات کرتے ہیں زیادہ قابل ہوں گے لیکن یہ بھی اسی درجہ کے نکلے
سب سے پہلے میں سید سلیمان ندوی کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

"مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس پورے ملک کا کوئی ایک نام
نہ تھا۔ ہر صوبہ کا نام الگ الگ تھا اور ہر ریاست کا نام اس
کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا اہل فارس نے جب اس
ملک کے ایک صوبہ پر قبضہ کیا تو اس دریا کا نام جن کو اب دریائے
سندھ کہتے ہیں اور جس کا نام عربوں کی زبان میں مہران ہے
سندھو رکھا پرانی ایرانی زبان اور سنسکرت میں س اور
آپس میں بدل کرتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ اس
لئے فارس والوں نے اس کو ہند کہہ کر پکارا

اور اس سے اس ملک کا نام ہند پڑ گیا عربوں نے جو سندھ کے علاوہ اس ملک کے دوسرے شہروں سے بھی واقف تھے انھوں نے سندھ کو سندھ ہی رہنے دیا۔ لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا اور یہی نام تمام دنیا میں مختلف صورتوں میں پھیل گیا اور ہ کا حرف الف ہو کر فرنچ میں انڈ اور انڈیا اور اس کی مختلف صورتوں میں ہو کر تمام دنیا میں مشہور ہو گیا اور خیبر سے آنے والی قوموں نے اس کا نام ہندواستھان رکھا جو فارسی تلفظ میں ہندوستان بولا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کنول ڈبائیوی صاحب اور دوسرے سمجھ لیں کہ اس ملک کا نام ہند یا ہندوستان کس نے دیا پھر اس ملک کا یہی نام پڑا۔ اگر لوگ تاریخی اور جغرافیائی نقطہ نظر سے تمام محققین کی باتوں پر غور کرتے تو ایسی بات نہیں ہوتی کہ لوگ الجھ جاتے آج دنیا میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ تمام کی تمام زبانیں قریب قریب اپنے علاقہ ہی کی نسبت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں یا پھر اپنی قوموں کے نام سے مثال کے طور پر چین کی چینی جاپان کی جاپانی ترک کی ترکی، روس کی روسی، جرمن کی جرمنی، اسپین کی اسپینی اپنے ملک میں مثال لیں، گجرات کی گجراتی، کشمیر کی کشمیری، آسام کی آسامی۔ بنگال کی بنگالی وغیرہ وغیرہ۔

امیر خسرو سے لے کر غالب تک جن نے بھی لفظ ہندی کا استعمال کیا یا ہندوستانی کیا۔ دراصل ان لوگوں نے ہندوستانی قوم کی زبان کہا کیونکہ ان کے زمانہ میں یا تو ان لوگوں کی زبان ترکی تھی یا فارسی اس لحاظ سے اہل ہند کی زبان کے طور پر انھوں نے ہندی یا ہندوستانی بھی اسی ملک کے نام کی مناسبت سے اس زبان کا نام رکھا۔ میرا خیال ہے کہ

مراسلہ نگار اور دوسرے قابل لوگوں کی تشفی اس معاملہ میں ہونی چاہیئے۔

قیصر رضا، پٹنہ

مراسلہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۵ء

میں اُردو کا نام کیوں تبدیل کرنا چاہتا ہوں

اس موضوع پر آئندہ کوئی تحریر شائع کرنے سے ہم معذور ہیں۔

(ادارہ)

۱۵ اپریل، ۱۵ اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۷۴ء کے ہماری زبان میں میرے خطوط اُردو کا نام بدلنے کے بارے میں شائع ہوئے ہیں۔ حالانکہ جگہ کی تنگی کی بنا پر انھیں مختصر کر کے شائع کیا گیا۔ پھر بھی کئی لوگوں نے موافقت میں اور کئی نے مخالفت میں جوابات دیئے ہیں لیکن کسی نے یہ تکلیف گوارہ نہیں فرمائی کہ اردو زبان کو اس کے اُردو نام کی اجنبیت کے باعث کیا کیا فوائد پہنچے اور کیا کیا نقصانات بقول تارا چند اٹھارہویں صدی میں اُردو ہندی کے نام سے جانی جاتی تھی اور عوام کی زبان تھی۔ میں یکم نومبر کے مضمون میں اس بارے میں کافی مواد پیش کر چکا ہوں جیسا کہ اُمید تھی نئی بات سے کچھ لوگ بھڑک اٹھے اور مجھ پر طرح طرح کے الزام رکھے گئے۔ کچھ لوگوں کا خاصہ ہے کہ جب کوئی نئی اسکیم اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو اہل مکہ کی طرح مخالفت کرتے ہیں۔ سر سید، مولانا ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی کی مثالیں سامنے ہیں کہ بعد میں ان تحریکوں نے ملک و قوم کو کتنا فائدہ پہنچایا لیکن کیا کیا جائے۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ میری بات کو ارباب ادب دیوانے کی بڑ نہ سمجھ کر سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ جو غلطی ابتداء میں ہو چکی ہے اس کا کچھ مداوا ہو سکے ابتداء میں اس زمانے کی مروج زبان کے بارے میں ہمارے بزرگ دھوکا کھا گئے ہمیں انگریزی کی دوررس فتنہ خیز سیاست کو نہ سمجھ سکے لارڈ میکالے کا کہنا ہے کہ اگر کسی قوم کو کمزور کرنا چاہو تو اس کا کلچر اور زبان تبدیل کرنے کی کوشش کرو۔ اسی اصول کی بناء پر انگریزی زبان سرکاری زبان بنائی گئی اسی کے اثر سے آج ہمارا معاشرہ کتنا تبدیل ہو چکا ہے۔ اور پرانی طرز زندگی میں کتنی تبدیلی آگئی ہے یہ آج کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب نے جتنا ادب خلوص و رواداری اور سادگی سکھائی تھی۔ اتنی انگریزی معاشرت نے بے حیائی اور فیشن پرستی مطلب اور بے مروتی سکھاتی ہے۔ لیکن یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔ میں اپنے یکم نومبر کے مضمون میں کئی لوگوں کے حوالوں سے بتا چکا ہوں کہ انیسویں صدی کے نصف تک عوام میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہندی کہلاتی تھی جس کا رسم الخط فارسی تھا اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھاکا یا بھاشا ضرور کہتے تھے اردو نہیں میں اپنے پچھلے مضمون میں گل کرسٹ کی تحریر اور پروفیسر محمد حسن کی توجیہہ بھی پیش کر چکا ہوں۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اردو نام کی کوئی زبان اس وقت تک نہ تھی سرکاری زبان چونکہ صدیوں سے فارسی رہی تھی اس لئے ماحول عربی فارسی کا تھا اور دانشور طبقہ بھی عربی فارسی اور فارسی رسم الخط سے زیادہ متاثر تھا حتیٰ کہ بھوجپوری، اودھی، برج بھاشا تک فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی جیسا کہ برج بھاشا اودھی اور بھوجپوری کے فارسی میں لکھے ہوئے پرانے مخطوطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس

لئے فارسی رسم الخط میں عربی و فارسی اور بھاشا کے الفاظ سے بنی سنوری۔ عام فہم ہندی زبان کو اُردو کا نام دے کر عوام سے رابطے کی زبان بنا دیا گیا اور سیاست یہ کی گئی کہ اس کے مقابلے کے لئے جدید ہندی کی دیوناگری رسم الخط کے ساتھ بنیاد ڈال دی گئی۔ اگر اس عوامی زبان کو اس کے اصل نام ہندی کے

فارسی رسم الخط

میں سرکاری زبان بنا دیا جاتا تو یہ زبان کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جدید ہندی جو فورٹ ولیم کالج میں دیوناگری لپی میں بنائی گئی اول تو بنائی ہی نہ جاتی اور اگر بنتی بھی تو کوئی دوسرا سنسکرت کا نام رکھنا پڑتا جیسا ملک کا ہندوستان نام (فارسی سے) کے مقابلہ میں بھارت نام کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے انگریزوں کو فارسی رسم خط اور عربی فارسی آمیزش سے بنی ہندوی زبان کو سرکاری زبان مجبوراً بنانا پڑا تھا کیونکہ دانشوروں کا ماحول عربی فارسی کا تھا۔ اور کلچر تک اسلامی طرز سے متاثر تھا مکتب کی تعلیم کا رواج تھا غرض کہ مجبوراً انگریزوں کو فارسی رسم الخط اپنانا پڑا۔ شروع میں جدید ہندی تک فارسی عربی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور رکھتی بنارس سے نکلنے والے اخبار جیسے راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند نکالتے تھے۔ کے بارے میں رامچندر شکل کہتے ہیں "پرچہ کی زبان اردو ہی رکھی گئی اگر حروف دیوناگری ہیں"۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ جدید ہندی کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نام مجلات میں لکھا گیا ہے نام فارسی اور سنسکرت رسم الخط دیوناگری جیسے کسی ہندو پنڈت کا نام ہری شنکر کے بجائے محمد حسین ہو بہرحال میں تو یہ کہوں گا کہ جدید ہندی اور اردو دونوں کے اس وقت کے بہی خواہوں نے انگریزوں کی اس نفرت آمیز چال کو نہ سمجھا اردو کے بہی خواہ اردو کو عربی فارسی کے ادق الفاظ سے سجاتے رہے اور ہندوستانی تلمیحات تک سے گریز کرتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی جیسے

عوامی اور ہندوستانی تلمیحات اور زبان استعمال کرنے والے شاعر کو انھوں نے شاعر تک تسلیم نہیں کیا۔ اردو کو فارسی اور عربی آمیز بنانے کی شکایت جناب جگر بریلوی نے اپنی کتاب "صحت زبان" میں بھی کی ہے۔ دوسری جانب جدید ہندی کے معمار اس میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونستے رہے۔ اردو شاعری گل و بلبل تک تھی جدید ہندی والے شیواجی، رانا پرتاپ اور اورنگزیب کے گرد گھوم کر رزمیہ شاعری سے معاشرے میں نفرت کا زہر گھولتے رہے اور فرقہ پرستی کے دائرہ کو وسیع کرتے رہے وہ وقت اور موقع کی تلاش میں رہے اور ملک کے آزاد ہوتے ہی اردو کو سرکاری دفتروں اسکولوں اور کالجوں اور ان جگہوں سے جہاں اس کی ترقی ممکن تھی نکال باہر کیا اردو کا مستقبل کیا ہے اس کے بارے میں لکھنا بیکار ہے سرکار اور لیڈروں کی ہمدردی صرف زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں جناب عبداللہ کمال نے یکم اگست ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں اردو مستقبل کے آئینہ میں کے عنوان سے کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ چونکہ اردو میں ذریعہ معاش کی کوئی کشش نہیں رہی اس لئے اردو داں طبقہ کم ہوتا جارہا ہے۔ آزادی کے بعد کی نسل میں غیر مسلموں میں تو کیا مسلمانوں میں بھی زیادہ اردو داں نہیں پائے جاتے انٹر کالج کے ٹیچروں سے پوچھئے کہ گورنمنٹ کے سہ لسانی اور دو لسانی فارمولے سے اردو کو بہت کم فائدہ پہنچا ہے۔ ہر صوبہ میں اس فارمولے میں ایسی زبانوں کے ساتھ اردو کا گٹھ جوڑ ہے کہ اردو کوئی لے ہی نہیں سکتا یو پی میں سنسکرت اردو کا ساتھ ہے تو پنجاب میں پنجابی کے مقابل اردو ہے۔ تائیے لسانی صوبوں میں صوبائی زبان کو چھوڑ کر اردو کون لینے کو تیار ہوگا۔ اس موضوع پر ہماری زبان کے پچھلے شماروں میں جہاں خلیل الرب ریٹائرڈ

ڈائرکٹر آف ایجوکیشن اور :خلاق اثر کافی لکھ چکے ہیں۔ سہ لسانی فارمولے ایک دکھاوے کی چیز ہے۔ اس سے اُردو کو کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ میں اردو کے نام کی تبدیلی کا صرف خواہاں ہوں کہ یہ نام انگریزی ڈپلومیسی کی دین ہے جو کسی صوبے یا ملک کے نام سے مناسبت نہیں رکھتا۔ جیسے بنگال سے بنگالی، پنجاب سے پنجابی، جاپان سے جاپانی وغیرہ اسی بناء پر مرحوم پروفیسر احتشام حسین کو مایوسی کے عالم میں کہنا پڑا کہ " اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندی یعنی جدید ہندی جس کا ارتقاء انیسویں صدی میں ہوا کُل ہندوستان کی زبان بن چکی ہے مختلف لسانی علاقوں میں مختلف زبانیں وہاں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں دستور میں اُردو کو بھی اس ملک کی ایک قومی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن اس کا کوئی علاقہ معین نہیں ہے۔ اس کا علاقہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ جسے ہندی کا علاقہ کہا جا سکتا ہے گو اردو ہندوستان کی ایک تسلیم شدہ زبان ہے اور پاکستان میں بھی علاقائی حیثیت سے اردو کا کوئی علاقہ نہیں۔ اگرچہ وہ وہاں کی بھی ایک تسلیم شدہ زبان ہے"۔ (مقدمہ لسانیات کا خاکہ ص۶)

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کی اس وقت ایسی حالت ہے جیسی کبھی یہودی قوم کی تھی کہ دولت اور کلچر سب کچھ تھا لیکن وطن نہیں تھا۔ یہودیوں اور انکی گمنام زبان عبرانی کو وطن مل گیا لیکن اردو کو کوئی وطن نہیں ملا اور نہ کوئی وطن ملنے کی امید ہے۔ آئین کی سولہ زبانوں میں پندرہ کا وطن ہے ایک اردو کا نہیں۔ حفیظ اور فیض تک اُردو کے مقابلہ میں اپنی وطنی زبان پنجابی کو ترجیح دیتے ہیں تو دوسرے کیوں کر اپنائیں گے۔ پچھلے نو سال میں معاشرے میں کتنی تبدیلی آئی ہے۔ لباس اور رہن سہن میں کافی تغیر آچکا ہے۔ اردو کا نام ہندی تو آپ اپنی بے پروائی سے کھو چکے ہیں۔ اب صرف ہندوستانی

نام ہی رکھ کر آپ اس کی سرفرازی کر سکتے ہیں۔ اس طرح اردو کا تمام سرمایہ
ہندوستانی کہلائے گا۔ آخر آپ بھی باہر جا کر ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ اگر آپ
اردو کو ہندوستانی[1] نام سے پکارنے لگے تو یہ آج کے ہندی داں طبقہ کے
لئے ایک لمحۂ فکر کیونکہ آج وہ خود اپنی اندھی سنسکرت نوازی سے پریشان ہے
انگریزی ٹیکنیکل اور روزمرہ کے عربی فارسی الفاظ ان کے لئے وبال جان
بنے ہوئے ہیں جب تک اس ملک میں انگریزی رائج ہے۔ ہندوستانی کا مستقبل
تابناک رہے گا۔ ادبی اردو کا نہیں اگر وقت کے تقاضے کو جیسے پہلے پورا
کیا جاتا تھا۔ اب بھی پورا نہیں کیا گیا تو مستقبل میں بیس پچیس سال بعد اردو
گنے چنے لوگوں کی زبان بن کر رہ جائے گی۔

مجھے تعجب ہے کہ ارباب ادب اس مسئلہ کو کیوں نظر انداز فرما رہے ہیں
میں خاص طور پر پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر گوپی
چند نارنگ، جناب آنند نرائن ملا، جناب نور الحسن ہاشمی جناب مسعود حسن خان
جناب مسعود حسن رضوی ادیب جناب خلیق انجم اور دیگر ارباب ادب سے عرض
کروں گا کہ وہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں اگر مناسب سمجھیں تو انجمن ترقی اردو
ہند دہلی کے ہونے والے کسی کل ہند جلسے میں اس موضوع کو زیر بحث لائیں۔

---

[1] یہ میرے ابتدائی خیالات تھے اب اس موجودہ کتابچہ میں نے اردو کے نام کے
انتخاب کا بار ارباب ادب چھوڑ دیا ہے۔ کنول ڈبائیوی

کتابیات

۱۔ کتب ہندی: ہندی پر فارسی کا پربھاؤ — از امبیکا پرشاد بھائی۔ ایم۔ اے

۲۔ ؍؍ ؍؍ ہندی اردو ہندوستانی — ؍؍ پنڈت پدم سنگھ ایم۔ اے

۳۔ ؍؍ ؍؍ کچہری کی بھاشا اور لپی — ؍؍ چندر بلی پانڈے ایم۔ اے

۴۔ مسلمانوں کی ہندی سیوا — ؍؍ ٹھاکر کمل دھاری سنگھ

۵۔ اردو: ہندوؤں میں اردو — ؍؍ محمد رفیق مارہروی

۶۔ ؍؍ ؍؍ ہندوؤں میں اردو — ؍؍ جگدیش مہتہ درد

۷۔ کتب ہندی: بھاشا وگیان — ؍؍ شیام سندر داس

۸۔ ؍؍ ہندی کے آیوروت گرنتھ — ؍؍ کرشن آچاریہ

۸۔ ؍؍ ہندی ساہتیہ کا اتہاس — ؍؍ ڈاکٹر نگیندر

۹۔ ؍؍ ہندی ساہتیہ کا اتہاس — ؍؍ ڈاکٹر دھیریندر ورما

۱۰۔ ؍؍ ؍؍ — ؍؍ رام چندر شکل

۱۱۔ ؍؍ ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس — ؍؍ ڈاکٹر اودے نرائن تواڑی

۱۲۔ اردو: ہندی ادب کی تاریخ — ؍؍ ڈاکٹر محمد حسن

۱۳۔ ہندی: ہندی ساہتیہ دویجن چن اتہاس — ؍؍ سوریہ کانت شاستری

۱۴۔ اردو کتب: اردو اپ بھرنش — ؍؍ پرسنا سین

۱۵۔ ؍؍ زبان اور علم زبان — ؍؍ پروفیسر عبدالقادر سروری

نمبر	کتاب	مصنف
۱۶۔	اردو کتب اردوئے قدیم	از حکیم شمس الدین قادری
۱۷۔	" ہندوستانی لسانیات	" ڈاکٹر محی الدین زور
۱۸۔	" تین ہندوستانی زبانیں	" ڈاکٹر کے۔ ایس بیدی
۱۹۔	" ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	" جون بیمز مترجمہ ڈاکٹر احتشام حسین
۲۰۔	" زبان اردو اس کا رسم خط	" سید مسعود حسن رضوی ماخوذ
۲۱۔	" مقدمہ شعر و زبان	" ڈاکٹر مسعود حسن خاں
۲۲۔	" اردو میں لسانی تحقیق	" عبدالستار ردولوی
۲۳۔	" مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو	" ڈاکٹر مسعود حسن خاں
۲۴۔	" اردو کا المیہ	" " " "
۲۵۔	" اُردو شاعری کا پس منظر	" ڈاکٹر سید اعجاز حسین
	" ہندوؤں میں اردو	" ڈاکٹر اجمل اجملی
	" اُردو سے ہندی تک	" ڈاکٹر عبدالودود
۲۵/۱	" کیفیہ	" علامہ برجموہن دتاتریہ
۲۵/۲۔	" اُردو داستانِ زبانِ اُردو	" ڈاکٹر شوکت سبزواری
۲۶۔	" پنجاب میں اُردو	" حافظ محمود خاں شیرانی
۲۷۔	" باپ کے خطوط بیٹی کے نام	" پنڈت جواہر لال نہرو
۲۸۔	" انگلس ڈس کوری آف انڈیا	" " "
۲۹۔	اردو ادبی تحریریں	" ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۳۰۔	ہندی انگریزی بھاشا اور اسکا ساتھ	" ڈاکٹر رام داودی
۳۱۔	اُردو نشورات	" برجموہن دتاتریہ کیفی
۳۲۔	" لسانیات اور اردو	" ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی
۳۳۔	" لسانی مطالعے	ڈاکٹر گیان چند جین
۳۴۔	اردو انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	" عبداللہ یوسفی

۳۵۔ اُردو خطبات عبدالحق — از بابائے اُردو مولوی عبدالحق

۳۶۔ " نقوش سلیمانی — " سید سلیمان ندوی

۳۷۔ " ہماری زبان (۱۵ اپریل لغایت ۲۲ جنوری ۱۹۷۵ء) و ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء

۳۸۔ انگلش ہسٹری آف انڈیا — از تھیورسٹن

۳۹۔ ہندی ہندی سروے کمیٹی کی رپورٹ — " رائے بہادر سیتارام

۴۰۔ انگلش این ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا — " موجمدار رائے ورتا

۴۱۔ اُردو تمدن ہند — " ڈاکٹر گستاولی مترجم سید امیر علی

۴۲۔ فارسی ذخیرۃ الخواتین جلد اول — " شیخ بھکری۔ بحوالہ رسالہ فکر و نظر شمارہ جلد ۱۰ سنہ ۱۹۷۰ء

۴۳۔ " تاریخ معصومی

۴۴۔ انگلش انڈو ایرین اینڈ ہندی — " ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی

۴۵۔ فارسی تاریخ جہاں کشا — " امیر علاء الدین۔ بحوالہ رسالہ فکر و نظر جلد ۱۰ سنہ ۱۹۷۰ء

۴۶۔ " جامع التواریخ — " وزیر الدین فضل اللہ "

۴۷۔ " دیوان لغت الترک محمود بن حسین محمود اشعری — "

۴۸۔ " رسالہ فکر و نظر شمارہ ۳۵ ۴ جلد ۱۰ سنہ ۱۹۷۰ء مضمون ڈاکٹر کمل ابوبی — "

۴۹۔ اُردو ہندوؤں کا تعلق اُردو سے / اُردو سے ہندوؤں کا تعلق — مولانا عبدالحلیم شرر ترتیب ڈاکٹر اجمل اجملی

۵۰۔ " ہندی سے اُردو تک — از ڈاکٹر عبدالودود

۵۱۔ " تاریخ ہندوستان جلد دوم — " مولوی ذکاء اللہ

۵۲۔ تاریخ تمدن (— " پروفیسر مجیب

۵۳۔ " طبقاتِ ناصری — " بحوالہ فکر و نظر

۵۴۔ فارسی بابرنامہ — ظہیر الدین بابر۔ طبع قازان بحوالہ فکر و نظر

۵۵۔ فارسی طبقات اکبری از ابوالفضل

۵۶۔ 〃 اقبال نامہ جہانگیری 〃

۵۷۔ اردو تاریخ فرشتہ جلد اول و دوم 〃 محمد قاسم شاہ ہندو شاہ فرشتہ

۵۸۔ 〃 تذکرہ ہندی گویاں 〃 مصحفی

۵۹۔ 〃 نکات الشعراء 〃 میر تقی میر

۶۰۔ 〃 ہندوستانی گرامر 〃 ڈاکٹر فیلن

۶۱۔ 〃 باغ و بہار 〃 میر امن

۶۲۔ 〃 نثر بے نظیر 〃 میر علی حسینی

۶۳۔ انگلش جنرل رائل ایشیا سوسائٹی ۱۹۲۰ء 〃 ڈاکٹر ڈیلی

۶۴۔ اردو مخزن نکات 〃 قائم چاندپوری

۶۵۔ 〃 گل کرسٹ اور اس کا عہد 〃 عتیق احمد

۶۶۔ 〃 دی ہندی اسٹوری ٹیلر جلد 〃 ڈاکٹر گلکرسٹ

۶۷۔ 〃 فرہنگ آصفیہ جلد اول 〃 مولوی سید احمد دہلوی

۶۸ فارسی آئین اکبری 〃 ابوالفضل

۶۹۔ فارسی چند چھند برنل جہا 〃 متنگ کولی

۷۰۔ ہندی انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد دوم ۱۹۲۹ء

۷۱۔ 〃 ہندی کا دیوتن چناتمک اتہاس از سوریہ کانت شاستری

۷۲۔ 〃 اقوام کی پیدائش اور قربت 〃 موسیو دیو یان

۷۳۔ 〃 ہسٹری آف انگلش لنگویج 〃 نکلن برناڈ

۷۴۔ 〃 السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء

۷۵۔ اردو زبان اور مسائل زبان 〃 پروفیسر عبد الغفار شکیل

۷۶۔ 〃 اردو شاعری کا پس منظر 〃 ڈاکٹر سید اعجاز حسین

۷۷۔ 〃 بنگالی ہندوؤں کی ادبی خدمات 〃 شانتی رنجن بھٹاچاریہ

۷۸۔ اُردو انیسویں صدی کی بنگالی اردو ادب از پروفیسر جاوید نہال

۷۹۔ " ہندوستانی اور انگریزی لغت " ولیم کارمچل اسمتھ

۸۰۔ انگریزی فرینڈس آف انڈیا ماہنامہ جون ۱۸۰۱ء

۸۱۔ " تاریخ تعلیم ہند از ڈبلو ایچ شارپ جلد اول

۸۲۔ اُردو مغل اور اُردو " نواب نصیر الدین خیال

۸۳۔ " تواریخ کلکتہ " محمد عبد اللہ

۸۴۔ " انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از عبد اللہ یوسف علی

۸۵۔ " زمانہ کا پریم چند نمبر ایڈیٹر دیا شنکر نگم

۸۶۔ " پریم چند کے کچھ وچار بنارس ۱۹۳۶ء " بحوالہ بھاشا اور سماج

۸۷۔ اردو، اردو پر ایک تحقیقاتی نظر " جگر بریلوی مرتب کیپٹن بہادر پرتاپ

۸۸۔ " تاریخ شعرائے اردو " ڈاکٹر نیلن

۸۹۔ انگلش اوریجن اینڈ ڈیولپ منیٹ آف لنگویج " ڈاکٹر سونتی کمار چٹرجی

۹۰۔ اردو، اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام " مولانا عبد الحق

۹۱۔ فارسی سرور الصدور " شیخ حمید الدین ناگوری

۹۲۔ اردو مختصر تاریخ ادب اُردو " ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم

۹۳۔ " جائزہ تاریخ اردو " شجاعت سندیلوی

۹۴۔ " تعارف تاریخ اردو " شرافت حسین آرزو ایم۔ اے

۹۵۔ " صحت زبان " جگر بریلوی

۹۶۔ " تاریخ ادب اردو " ڈاکٹر نذیر احمد عبادالله

۹۷۔ اردو انڈ ایرین اینڈ ہندی — از ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی
۹۸۔ ناگری ہندی، ہندی بھاشا اور اس کے اتہاس کا وکاس — ″ ترجمہ عتیق احمد صدیقی
۹۹۔ اردو عرب ہند کے تعلقات — ″ سید سلیمان ندوی
۱۰۰۔ انگلش لنگوئسٹک سروے آف انڈیا جلد اول حصہ اول — ″ سرجارج گریرسن
۱۰۱۔ ″ زبان میں ارتقا — ″ سپیرسن
۱۰۲۔ انگلش ہند آریائی لسانیات کے چند مسائل — ″ جولس بلاک
۱۰۳۔ اردو تنقیدات — ″ عبدالحق
۱۰۴۔ ″ قومی یک جہتی اور سیکولرزم — ″ ڈاکٹر تارا چند
۱۰۵۔ ″ ہندوستانی زبان — ″ امام اکبرآبادی
۱۰۶۔ ″ شاعر کا قومی یک جہتی نمبر ۱۹۷۰ء — ″ اعجاز احمد صدیقی
۱۰۷ ″ حیات سلیمانی — ″ شاہ معین الدین ندوی

حرفِ آخر

زیرِ نظر کتاب "اُردو زبان اور اس کا نام" آخرکار تین سال کی مسلسل جد و جہد اور کاوش کے بعد آپ کے سامنے ہے جس وقت میں نے اس موضوع پر کام شروع کیا تھا تو میری معلومات اس موضوع پر بے حد قلیل تھیں کیونکہ میں آجکل ایک ایسے قصبہ کے کالج سے وابستہ ہوں جہاں اس موضوع پر ہندی کتب کے علاوہ دوسری زبان کی کتب دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں لیکن ہر کوشش کے ساتھ یہ قدرت کا تعاون رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے گا ہے اس موضوع پر کتب ملتی رہیں اور میں اُن میں کے حوالے جات کتاب میں شامل کرتا رہا۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کتاب کی تحریری تکمیل ہو چکی اور بعد میں کوئی حوالہ یا ثبوت ایسا ملا کہ جس کو کتاب میں شامل کرنا بے حد ضروری سمجھا گیا تو اس کے لئے اس باب کو دوبارہ لکھا گیا اور کہیں پیراگراف کی عبارت کو بدلا گیا تو کہیں حاشیہ کے طور اس عبارت کو کتاب میں شامل کیا گیا جس کی وجہ سے کتاب میں کہیں کہیں کچھ بے ترتیبی سی شاید نظر آئے۔ چار پانچ سو صفحات کے مسودے کو ردوبدل کر کے ہاتھ سے تحریر کرنا بھی مجھ جیسے اعصابی امراض کے مریض کے لئے سہل کام نہیں تھا۔ لیکن کچھ نت نئے حقائق اور نئی معلومات کا جوش کچھ احباب کی ہمت افزائی اور کچھ میرے عزیز برخوردار ابن کنول ایم۔ اے ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی کی ذاتی کاوش اور کچھ قاضی یونس سلیم اُردو ٹائپسٹ طبیہ کالج اور منشی مدن گوپال زلفی ریٹائرڈ اُردو ٹیچر جونیئر ہائی اسکول ڈبائی کے تعاون سے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔ آپ اگر اس کتاب

کا مطالعہ کریں گے تو یہ بات صاف نظر آئیگی کہ کتاب کے آخری صفحات کی کتابت ہوتے وقت تک اس کے مضامین میں ترمیمات ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات کتاب کے مطالعے سے صاف نظر آجائے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے اس موضوع پر کہاں تک کامیاب ہوا ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں انگریز کے دو سو سال پرانے بنائے ہوئے معنوی تعلیمی سماجی معاشرتی تاریخی لسانی منافرت کے جال کو توڑنا پڑے گا اور انگریز قوم اور ان کے مذہبی متعصب حکمرانوں سیاست دانوں مورخوں مصنفوں کو ہمیں اپنی قوم کا دشمنِ اوّل سمجھنا پڑے گا اور اپنے تہذیبی معاشرے ادب و ثقافت سیاست اور تاریخ کو مشرقی زاویے اور نئے رُخ سے موڑنا پڑے گا۔ ہمیں دو ہزار سال میں کسی قوم اور تہذیب اور معاشرے نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا مغرب کی کورانہ تقلید کے جادو نے پہنچایا۔

نیاز مند

پرستار وطن کنول ڈبائیوی

شعبۂ اُردو، کے۔ آئی۔ کالج ڈبائی ضلع بلند شہر

Scanned by CamScanner

مصنف کی پہلی تخلیقات سوز وطن اور لبساط زیست کے بارے میں دانشورانِ ادب کی آراء کی ایک جھلک

۱۔ تبصرہ آل انڈیا ریڈیو ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء اردو مجلس۔ سوز وطن ایک بہترین حب الوطنی کے جذبات سے لبریز تخلیق ہے بزبان ڈاکٹر خلیق انجم

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور سابق جنرل سکرٹیری انجمن ترقی اُردو ہند
ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کے کلام کی روح وطن پرستی ہے ان کے لئے ایک روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

۳۔ شاعر اتحاد وطن علامہ فیاض گوالیاری۔ آپ کا تحفہ "سوز وطن" ملا دل تڑپ گیا بہت بہت شکریہ آپ کو وطن عزیز کی خدمت کے لئے ہمیشہ قائم و دائم رکھے آپ کے پرستار وطن ہونے کے متعلق میرے ایمان کو پختہ کر دیا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ کلام کا موضوع بہت بلند ہے اس موضوع پر اس قدر کہنا آپ ہی کا کام ہے۔

۵۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں۔ آپ کی حب الوطنی سے لبریز نظمیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے حالی و چکبست کی شاعری کی فضا میں چلا جاتا ہوں۔

سید جواد علی زیدی۔ وطنی اور قومی نظموں کا ایسا بھرپور مجموعہ کافی دنوں کے بعد دیکھنے میں آیا ہے۔ یکجہتی وطن پرستی اور اخلاقی استواری ہر اعتبار سے نظمیں جاذب توجہ ہیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ مجموعہ اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے مجھے بہت مسرت حاصل ہوئی ہے مجھے اُمید ہے کہ "سوزِ وطن" آپ کو حیاتِ ابدی سے ہمکنار کرے گا۔

ڈاکٹر قمر رئیس۔ کتاب ہر لحاظ سے دیدہ زیب اور دل کش ہے دیدہ ر

پرشاد سکسینہ کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ آپ کی بہت سی وطن پرستانہ نظموں کو شامل نصاب ہونا چاہیئے۔

دیویندر پرشاد سکسینہ۔ ڈاکٹر کنول کا شمار اردو کے قابلِ ذکر قومی شعرا میں ہوتا ہے۔ سرور جہاں آبادی کی طرح آپ نے سارے ہندوستان کے قومی خیالات کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔"

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ایسی شاعری کی بڑی ضرورت جو ملک کی مٹی سے اپنا رس اور جس حاصل کرتی ہو۔ سوز وطن کی شاعری سے اپنے وطن کی محبت پر ایمان تازہ ہوتا ہے۔

پرکاش پنڈت۔ سوز وطن کی قومی جذبات سے معمور نظمیں تو دلوں کو برماتی اور گرماتی ہیں۔

کھیم چند سمن۔ سوز وطن میں جو جذبہ کارفرما ہے۔ وہ ہر قوم پرست اور محب وطن کے لئے وہ راستہ دکھانے والا ہے جو آگے والی نسلوں کو روشنی بخشے گا۔

جناب ایم چنا ریڈی سابق گورنر یوپی۔ سوز وطن آپ نے بڑی عرق ریزی سے شائع کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آئندہ بھی آپ کی وطن کی پرخلوص خدمت کرتے رہیں۔

علامہ ابر احسنی گنوری؛ ڈاکٹر کنول کی ہر نظم اردو دشمنوں کے پروپیگنڈے کی تردید کر رہی ہے جو کہتے ہیں اردو شاعری میں ہندوستان کی کوئی چیز نہیں وہ ایران و عرب کی اصطلاح کام میں لاتے ہیں۔

سید شہاب الدین دسنوی۔ سوز وطن کی وطنی اور قومی شاعری ملک و قوم کی بڑی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

پروفیسر عبدالقادری سروری مرحوم۔ ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کو خدا نے وطن دوست دل اور شاعرانہ ذہن عطا کیا ہے اس مجموعے کی نظمیں ہماری قومی اور وطنی شاعری میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی نظموں میں حب وطن اور رواداری کے جذبات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

علامہ میکش اکبرآبادی۔ ان کے تخلص کی طرح ان کی شاعری کا سارا گردو پیش خالص ہندوستانی ہے۔ یہ مجموعۂ کلام اہل دل اور اہل نظر کے طبقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر ہنس راج گپت۔ اس میں دلیش بھگتی جیسے کٹھن دِشے کو تیاؤں میں سدل اور سندر ڈھنگ سے پیش کیا گیا دلیش کو کو تیاؤں سے یہ پڑنا ملے گی۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی مدیر سب رس۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے پنڈت برج نرائن چکبست اور درگا سہائے سرور کی یاد تازہ ہوتی جاتی ہے۔ نظموں کا موضوع موجودہ دور کا ہندوستان ہے۔ اس لئے اثر آفریں بھی ہے اور پُرسوز اور دل آویز بھی۔ جذبہ وطن اور جذبہ قومی پیدا کرنے میں یہ مے دوآتشہ ثابت ہوگی۔

پروفیسر کرامت علی مبصر شاخسار کٹک۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ کنول ڈبائیوی کی اکثر قومی اور وطنی نظمیں خارجی موضوعات سے وابستہ ہونے کے باوجود بڑا شاعرانہ حسن و دل رکھتی ہیں۔

سرور تونسوی۔ ایڈیٹر شانِ ہند دہلی۔ " اگر آپ کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں وطن کی محبت قومی یکجہتی اور انسانیت کے جراثیم موجود ہیں تو" بساطِ زیست اور "سوزِ وطن" کا مطالعہ آپ کے لئے انتہائی دل خوش کن ہوگا۔

ڈاکٹر بیتاب علی پوری معاون ایڈیٹر۔ اشوک چکر ہندی۔ سوز وطن حب الوطنی پر ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی بیش قیمت تخلیق ہے۔ ان نظموں میں نیکی شرافت انسانیت کا احترام کارفرما ہے۔ یہ مجموعہ ہر محب وطن کو مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

اختر الاسلام مبصر ماہنامہ پیکر ہندی۔ اس سنکلین میں ڈاکٹر کنول کی راشٹریہ کوتائیں دل میں ایک دم گھر کر جانے والی ہیں اچھی شاعری کی دشیشتا ان میں ہے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ اُردو کی خدمت سعادت اور شرف ہے اور یہ شرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو وطن کی تہذیبی قدروں کو دل سے عزیز رکھتے ہیں اور آپ

کا شمار ان ہی لوگوں میں ہے۔

جگن ناتھ آزاد۔ بساطِ زیست کی شاعری حب الوطنی کی شاعری ہے اس کی حب الوطنی ادھوری حب الوطنی میں مختلف موضوعات تک پھیلی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں۔ حب الوطنی سے سرشار آپ کی شاعری ہر ہندوستانی کی نظر میں اپنا مقام حاصل کرے گی۔ آپ ہمارے دوسرے چکبست ہیں۔

ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کنول صاحب روایتی شاعری سے الگ ہٹ کر کھلی ہوا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری۔ بہت اچھا مجموعہ ہے۔ جذباتِ وطنی سے بھرا ہوا ہے۔ جذبات و خیالات کے اعتبار میں خلوص و بے ساختگی نمایاں ہے۔ آپ اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہیئے۔ یہ اپنا انعام خود ہے۔

ڈاکٹر ناصر حسین نقوی۔ کنول ڈبائیوی کے کلام میں جس طرح کا اجتماعی شعور ملتا ہے وہ ان کو اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے ممتاز اور منفرد بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر مبصر آجکل دہلی صحیح معنوں میں یہ مجموعہ اچھی صحافتی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مقصدی اور بیانیہ شاعری کے باب میں یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔

اعجاز احمد صدیقی مدیر شاعر۔ ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی نظموں کا ماحول خالص ہندوستانی ہے قومی زندگی کی بہت سی جھلکیاں ان نظموں میں نظر آتی ہے۔